ضروری باتیں

اس شمارے کے سرورق پر کتاب 'مشاہیر کے خطوط گوپی چند نارنگ کے نام' کا عکس شائع کیا گیا ہے۔ یہ بیش قیمت کتاب چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں پروفیسر نارنگ کے ہمعصروں میں تقریباً سبھی مشاہیر ادب کے خطوط موجود ہیں۔ ترتیب حروف تہجی کے حساب سے ہے تاکہ چھوٹے بڑے کے بیجا سوالات سے بچا جا سکے۔

خطوط کیا ہیں؟ خطوط نگاری کیا ہے؟ بابائے اردو مولوی عبدالحق خط کے بارے میں رقمطراز ہیں، ''خط دلی خیالات وجذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا صحیفہ ہے۔''

غیر موجود شخص سے تحریری طور پر یکطرفہ گفتگو کرنا خطوط نگاری کہلاتا ہے۔ اس تحریر میں وہ باتیں بھی رقم ہو جاتی ہیں جن کا روبرو کہنا محال ہوتا ہے۔ خط میں شکاتیں، معاشی تنگ دستی، بیماری، گھریلو اور سماجی مسائل ومصائب کا ذکر اور مدد کی درخواست سب کچھ لکھ دینا آسان ہوتا ہے۔

مکتوب نگاری کا رواج قدیم زمانے میں بھی تھا۔ دیگر زبانوں کی طرح اردو ادب میں بھی مکتوب نگاری کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ مرزا غالب اور ابوالکلام آزاد کے خطوط نے اردو مکتوب نگاری کو استحکام عطا کیا۔

مرزا نے خطوط نگاری میں لفظوں کی بازی گری کی فرسودہ روش سے ہٹ کر اس میں زندگی کی حرارت کو شامل کیا۔ یہ جملہ جو بار بار کہا جاتا ہے کہ غالب نے مراسلہ کو مکالمہ بنا دیا، حقیقت پر مبنی ہے۔ اس سے قبل کی مکتوب نگاری کو غالب کی باکمال مکتوب نگاری کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔

غالب کے خطوط معلومات کا گنجینہ ہیں۔ غالب کے خطوط سے ان کے سیاسی، سماجی شعور کی پختگی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اپنے خطوط کے توسط سے اپنے شاگردوں کی شعری اصلاح کی۔ زبان وبیان کا سلیقہ سکھایا۔ لفظوں کے نشست وبرخواست کی بات کی۔

مرزا غالب نے خط کو آدھی ملاقات کا نام دیا، یہ خیال آج بھی ہمارے درمیان مستحکم ومروج ہے۔

غالب کی شاعری کی نہ جانے کتنی شرحیں آچکی ہیں لیکن غالب کی مشکل پسندی پر آج بھی مقتدر ادب سر دھنتے رہتے ہیں۔ اپنے شعری وتیرے کے برعکس مرزا نے مکتوب نگاری میں مشکل پسندی کو جگہ نہ دی۔ مرزا نے مکتوب نگاری میں سادہ اور سہل نگاری کو اولیت دی۔

غالب کے خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جیسے ''عودِ ہندی''، ''اردوئے معلیٰ''، ''مکاتیب غالب''، ''مہر غالب'' وغیرہ۔

مکتوب نگاری میں ابوالکلام آزاد کا نام بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مولانا کے بھی خطوط کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''غبار خاطر''، ''مکاتیب ابوالکلام آزاد''، ''نقش آزاد''، ''تبرکات آزاد'' اور ''کاروانِ خیال'' اہم ہیں۔ جن میں 'غبار خاطر' کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔

سر سید احمد خان کے خطوط کا مجموعہ ''مکاتیب سر سید'' کے نام سے، مولانا حالی کے خطوط ''مکاتیب حالی'' کے نام سے، علامہ شبلی نعمانی کے خطوط ''مکاتیب شبلی'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مکتوب نگاری اردو ادب میں ایک نثری صنف کی حیثیت حاصل کر گئی۔

بقول رشید احمد صدیقی غزل اردو شاعری کی آبرو ہے۔ دیگر بیشتر شعری اصناف کی طرح غزل بھی فارسی سے اردو میں آئی۔ فارسی شاعری میں غزل کا پہلا شاعر رودکی سمرقندی (۸۷۳ء) کو کہا جاتا ہے۔ اسے فارسی شاعری کا باوا آدم بھی کہتے ہیں۔ باوا کے معنی باپ اور استاد کے ہیں جو فارسی نہیں بلکہ ہندی زبان کا لفظ ہے۔ مکتوب نگاری کا بھی کوئی باوا آدم ہوگا لیکن ابھی تک تمام بحث کے باوجود یہ طے نہیں ہو سکا ہے کہ اولین مکتوب نگار کون ہے۔

مکوتب نگاری کی بزم میں رسائل کا ذکر کئے بغیر بات نامکمل رہے گی۔ کس رسالے میں پہلا خط شائع ہوا، یہ بھی اب تک تحقیق طلب ہے۔ کسی شخص کے خط کو فوری طور پر منظر عام پر لانے کے لئے رسائل ایک بہترین اور مؤثر ذریعہ ہیں۔

کئی رسائل نے خطوط نمبر شائع کئے مثلاً ''ایشیا''، ممبئی مرتبہ ساغر نظامی، مکاتیب نمبر (روحِ ادب 1941ء)، ''آجکل'' دہلی، خطوط نمبر مرتبہ جوش ملیح آبادی 1954ء اور ''نقوش'' لاہور مرتبہ محمد طفیل، مکاتیب نمبر دو حصے، 1956ء اور خطوط نمبر، تین حصے 1968ء میں شائع ہوئے۔ اس ضمن میں اس کے علاوہ بھی کئی رسائل کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔

جدید تکنیک نے مکتوب نگاری کو اچھا خاصہ نقصان پہنچایا ہے۔ اب خط تو نہ کے برابر ہی لکھے جاتے ہیں۔ فون، موبائل پر گفتگو کر کے کام چلا لیا جاتا ہے۔ حالانکہ مکتوب نگاری کی افادیت آج بھی برقرار ہے۔ مکتوب نگاری میں یک طرفہ اپنی بات کہنے کا پور موقع ملتا ہے جبلکہ فون، موبائل پر قطع کلام ہوتا رہتا ہے، دل کی پوری بات کہہ پانا مشکل ہوتا ہے۔

خطوط سے رسالے کی سمت ورفتار پر بھی فرق پڑتا ہے اور بلندی کی منازل بھی طے ہوتی رہتی ہیں۔ اس لئے ہم بار بار اصرار کرتے ہیں کہ قارئین کو اپنی بیش قیمت آرا سے مدیران کو ضرور آگاہ کرتے رہنا چاہیے۔

دانش الہ آبادی

۳۰ جون، ۲۰۲۰

سبق اردو

جولائی، ۲۰۲۰ء

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: ڈاکٹر محمد سلیم | سرورق: دانش الہ آبادی | جلد : ۵ | شمارہ : ۴

موبائل: 9696486386 | سرنامے کی خطاطی: دانش الہ آبادی | Banking:SABAQ -E-URDU(MONTHLY)

واٹس ایپ: 9919142411 | کمپوزنگ: دانش الہ آبادی، اہل قلم | IFSC BARB 0 GOPI BS A/C28240200000214

sabaqeurdu@gmail.com | مطبع: عظیم انڈیا پریس، گوپی گنج، بھدوہی | web:www.sabaqeurdu.com,ISSN:2321-1601

فی شمارہ :-/25، بارہ شمارے:-/250 | اعزازی تعاون:-/2000، تاحیات خریداری:-/5000 | Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA

کسی بھی تحریر سے ادارہ کا متفق ہونا لازمی نہیں ہے۔ کسی بھی معاملے کے سنوائی صرف ضلع بھدوہی ہی کی عدالت میں ہوگی۔ ادارہ

ایڈیٹر	ضروری باتیں	۱
مکتوبہ مرتضی خواجائیوا	' ازبکستان میں اردو کی تعلیم وتدریس: تناظر اور مسائل	۳
علی محمد فرشی	تین نظمیں	۷
ابوبکر عباد	پروفیسر آل احمد سرور کی فکشن تنقید	۹
ابوبکر عباد	تین نظمیں	۱۵
ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر	اقبال کا فلسفۂ عقل و عشق	۱۷
ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی	تصوف، تزکیہ اور کبیر	۱۹
مبین مرزا	تین غزلیں	۲۱
مبین مرزا	واٹس ایپ	۲۳
مبین مرزا	دو غزلیں	۲۷
زکریہ ورک	ابن رشد	۲۹
دیپک بدکی	وہ دکھ بھرا دن	۳۳
مھوش نور	اسماء حسن: ھانگ کانگ ...	۳۵
غالب، منٹو	خبر	۳۸
بلال احمد ڈار	شرر بحیثیت انشائیہ نگار	۳۹
محمد مصدق	بچوں کی نفسیات اور ادب...	۴۱
آھوشنگ مرادی کرمانی	خبر	۴۴
ڈاکٹر محمد اقبال خان	اردو زبان و ادب پر ...	۴۵
اکٹر محمد سلیمان	کشمیر کے "پریم چند" پریم ناتھ پردیسی	۴۷
ڈاکٹر شیخ عقیل احمد	تفہیمات و ترجیحات	۵۰
عبیدالرحمن	مولا نا ابوالکلام آزاد کا تعلیمی رجحان	۵۱
ڈاکٹر محمد نہال افروز	عصری مسائل اور ابلیس ...	۵۴
لیاقت علی	جموں و کشمیر کے نمائندہ ...	۵۷
محمد خوشتر	' خیال صورت ' تنقیدی جائزہ	۶۳
آسناتھ کنول	ھتھیلی	۶۵
عمر آفریدی	نائن الیون کے بعد افغانستان...	۶۷
ڈاکٹررؤف پاریکھ	...دو عظیم لغات کا تذکرہ	۶۹
دیپک بُدکی	جتیندر بلّو کی سوانح ...	۷۱
دیپک بُدکی	گُناہِ کبیرہ	۷۳
حکیم سید ظل الرحمن	طلسم انسانی جسم	۷۵
خبریں	اردو اکادمی، NCPUL	۷۷
سن تو سہی	ڈاکٹر شفق	۷۹
مجلس ادارت	EDITORIAL BOARD	۸۰

چیف اڈیٹر

ڈاکٹر دانش الہ آبادی

ازبکستان میں اردو کی تعلیم وتدریس: تناظر اور مسائل

مکتوبہ مرتضیٰ خواجائیوا

موجودہ زمانے میں مشرقی ممالک کے ساتھ جمہوریہ ازبکستان کے سیاسی، معاشی، ثقافتی اور تجارتی تعلقات کی ترقی کی بدولت اس پر زور دیا جارہا ہے کہ اس ملک میں مشرقی زبانوں خاص طور پر ہندی اور اردو کے ماہرین کی تعداد زیادہ سے زیادہ ہو کیونکہ ثقافتی ترقی کے لیے زبانوں کا جاننا ضروری ہے اور یہ ازبکستان کی ہمہ جہت ترقی کے لیے اہم کی بات ہے۔ اسی لیے ازبکستان میں اردو اور ہندی کی تعلیم وتدریس پر زیادہ توجہ دی جارہی ہے۔

ازبکستان میں اردو تدریس کی 75 سالہ تاریخ ہے۔ اردو کی تعلیم کا آغاز روسی اسکالرز نے 1947 میں کیا تھا۔ ازبکستان میں تدریس اردو کی ترقی میں رحمن بیبر دی محمد جانوف (۱)، نبی محمد دوف (۲) ، تاش مرزا خالمیر زائیوف، انصارالدین ابراہیموف (۳) ، انستاسیا بیانووا (۴) جیسے اساتذہ کی گران قدر خدمات ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی زبان کی نشوونما میں ادب کی اہمیت بڑی ہے۔ ادبی شاہکاروں سے قوموں کو متعارف کرانے میں مترجموں کی خدمت بیان سے باہر ہے۔ گذشتہ برسوں میں، رحمٰن بیردی محمد جانوف، نبی محمدوف، تاش مرزا خالمیر زائیوف، انصارالدین ابراہیموف کی طرف سے غالب، اقبال، فیض کی تصانیف کا ترجمہ ازبکی میں کیا گیا تھا، اور ازبک زبان سے بھی بڑی مہارت کے ساتھ عظیم شاعر میر علی شیر نوائی، بابر کے کلام ترجمہ کیا گیا۔ ترجمے کے میدان میں ہندوستانی عظیم پروفیسر قمر رئیس کے کارنامے بے بہا ہیں۔ ان کی بدولت کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ ان کوششوں سے اردو ادب کے نمونے ازبک میں اور ازبک ادب کے نمونے اردو میں منظر عام پر آئے۔

فی الحال، تاشقند سرکاری مشرقیاتی انسٹیوٹ میں 78 طلباء پہلی مشرقی زبان کے طور پر اردو پڑھ رہے ہیں اور 40 طلباء دوسری مشرقی زبان کی حثیت سے اردو سیکھ رہے ہیں (۵)۔ اردو پر کئی درسی کتابیں تیار کی گئیں (۶) اور تیار کی جارہی ہیں۔ اردو زبان کے تدریسی طریقوں پر بھی تحقیق کی جارہی ہے۔ میں اردو زبان کی درس تدریس کی ایک سب سے مشکل پہلو صوتیات پر توجہ دینا چاہتی ہوں۔ گرچہ اردو اور ازبک زبانوں کے مابین اس لحاظ سے مشابہت ہے، لیکن تحریر اور صوتیات میں کافی فرق ہے۔ ازبک زبان لاطینی پر مبنی ہے اور اردو حروف تہجی عربی- فارسی ہے۔ یہ امر اردو کو غیر ملکی زبان کی حیثیت سے سیکھنے والوں کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

ہر زبان کے نظریاتی علم کی تعلیم کے مشترکہ طریقوں کا ایک مجموعہ ہوتا ہے: صوتیات، مورفولوجی، علم نحو وغیرہ۔ مثال کے طور پر، اردو فونیٹکس کے ہر فونی بیان کیا جاتا ہے، جو ازبک میں فونمز کے ساتھ اس کی مماثلتیں اور فرق سمجھائے جاتے ہیں، اور اس میں دو حرکتیں عمل میں آجاتی ہیں:

۱) ہر فونم کا تلفظ ریکارڈ کر کے نشر کیا جاتا ہے، اور طلباء کو اس کو دوہرانے کی ضرورت ہوتی ہے۔

۲) اسی فونمز کو الفاظ کی ترکیب میں ریکارڈ کرتے ہیں اور طالب علم سے سنواتے ہیں تا کہ وہ باربار دہرائیں

اس طرح، تلفظ کو سدھرنے پر زور دیا جاتا ہے، آجکل یہ سہولت بھی ہے کہ ہر شخص کے پاس ایک اسمارٹ فون ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر کلاس میں اس کا استعمال کیا جاتا ہے۔

اردو صوتیات ایک ایسا موضوع ہے جس میں اساتذہ اور طالب علم دونوں کی طرف سے حساسیت اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ کسی بھی زبان کو سیکھنے کی شروعات صوتیات سے ہوتی ہے۔ زبان کی بنیادی حصہ صوتیات اور تحریر ہے۔ اس میں اردو لکھنے کی تعلیم دینے کا طریقہ زیادہ پائیدار اور کامل ہونا چاہئے۔ تجربات کے مطابق، اردو رسم الخط میں دو اور چار شکل کے حروف کا وجود، اور ان کی شکل کی مماثلتیں سیکھنے والوں میں خوف اور تھوڑا سا الجھن پیدا کرتی ہیں۔ شروع میں دو شکل کے حروف کو سکھایا جائے تو سیکھنا آسان ہوتا ہے۔ تدریسی تجربہ کے مطابق یہ بھی قابل ذکر ہے کہ صوتیات میں دونوں زبانوں کی مشترکہ آوازیں سیکھانے کے بعد ہی اردو کے خاص حروف سکھائے جائیں۔ ہمارے یہاں اس کا رواج ہے۔ درج ذیل نقشے میں اردو اور ازبک صوتیات کا تقابلی تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ دونوں زبانوں کی خصوصیات بھی دونوں زبانوں کے مابین فرق سے سمجھا جاتا ہے۔ جیسا کہ نقشے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں زبانوں کے درمیان مماثلت (دونوں زبانوں میں 16 حروف کا تلفظ ایک جیسا ہے) ہیں۔ اس وجہ سے طلباء کے لیے اردو سیکھنا آسان ہوتا ہے۔ جہاں دونوں زبانوں کے صوتیات میں فرق کا تعلق ہے وہاں کچھ دشواریاں ہیں۔ جیسے اردو میں بڑے مصوتے (:,u:,i:a)، مرکب مصوتے (au, ao)، غنائی مصوتے (eN, N, :N, u:N, i:a aN, iN, uN, aoN oN,a?N,) ، ہاکار مصمتے (...... dh ph, bh,) ، ماقوسی مصمتے (T,D,R) موجود ہیں ان کو سکھانے میں مندرجہ ذیل طریقے مستعمال ہیں: - آڈیو لنگول اور آڈیو ویزوئل طریقہ۔ جس کے مطابق طلباء ریکارڈ سیفونم سنتے ہیں تختے پر ان کی شکل دیکھ کر حروف سیکھتے ہیں۔ اس کے دوران ہم طلباء کے علم کی جانچ پڑتال کرنے کے مقصد سے زیادہ تر املا لکھواتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایم پی ٹری سن واکر اپنا تلفظ درست کرتے ہیں۔

- ہوا یا اناج میں لکھ کر پڑھانے کا طریقہ۔ یہ طریقہ یادداشت کی مشقوں کے لیے

سینئر لیکچرر، شعبہ جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیائی زبانیں، تاشقند سرکاری مشرقیاتی انسٹی ٹیوٹ، تاشقند، ازبکستان
said_lola@mail.ru

بہت اہم ترین ہے، یعنی، اس سے حروف (ج گروپ، ب گروپ...) کو یاد رکھنے میں مدد ملتی ہے جن کی شکل ایک ہی ہے لیکن صرف نکات میں فرق ہے۔

خوشخط لکھنے کی کاپیاں اور ورک بک کا استمال کرنا۔ یہ ہمارے لیے جدید طریقہ ہے، کیونکہ اردو پر ایسی کتابیں ہمارے پاس نہیں تھیں، لیکن پچھلے 10 سالوں سے استعمال ہوتا آرہا ہے۔

صوتیات اور گرافکس کے میدان میں مہارت حاصل کرنے کے بعد گرامر کو شروع کرتے وقت میں زیادہ ہوشیار رہنا پڑتا ہے، کیوں کہ دونوں زبانوں کی گرامر میں فرق ہے اردو میں اسماء کی تانیت و تجنیس ہے، زمانہ فعل کی تعداد 8 ہیں، حالانکہ ازبک میں جنس بالکل نہیں ہے اور وقت کے منصوبے کے مطابق زمانہ فعل تین ہیں۔

گرامر کی نظریات کے سبق معمولی (روایتی شکل میں) طور پر ترتیب کیا جاتا ہے لیکن مشقیں اور متن پر جو قواعد کو مضبوط بنانے میں بارے معاون ثابت ہوتے ہیں ان کے لیے الگ پریکٹس میں ہم روایتی اور ماڈرن طریقوں کو عمل میں لاتے ہیں۔

اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ ہمارے ہاں علی تعلیمی اداروں کے لیے خاص منصوبہ ہوتا ہے اس کے مطابق ہر ایک نئے قاعدہ کے اوپر متعین متن اور مشقیں ہوتی ہیں۔ ان پر علمی کام کرنا ضروری ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ مندرجہ ذیل جدول میں دیا گیا ہے۔

سبق کی شکل	استعمال شدہ طریقے	موضوعات
روایتی+ماڈرن	– storm" "Brain "دماغی حملہ"	نئی گرامر
ماڈرن	سنکر سمجھنا ، یم پی ٹری ماڈرن	نئی گرامر سے وابستہ ٹیکسٹ
روایتی	زبانی اور تحریری ترجمہ (پہلے اردو سے ازبکی میں)	نئی گرامر پر مشقیں
روایتی ماڈرن	extra, find cluster لسانی اور قواعد کا جائزہ لینا ، TPR کا طریقہ	متن کے الفاظ ور قواعد پر مشقیں
ماڈرن	سوال-جواب، بحث	متن پر مشق کرنا
روایتی	ٹیسٹ یا کنٹرل کام	نئے الفاظ ور محاوروں پر ٹیسٹ
روایتی	کنٹرل کام یا ٹیسٹ	نئے موضوع پر مکمل ٹیسٹ
روایتی	تحریری مشقیں کرنا	غلطیاں دور (درست) کرنا

جیسا کہ دیئے گئے ٹیبل سے دیکھ سکتے ہیں کہ ہر ایک نئے موضوع پر 8-9 مختلف قسم کے کام ہوتے ہیں۔ اس عمل کے کچھ قابل غور ہے، یعنی، زیادہ تر کلاسوں میں روایتی انداز میں سکھائے جاتے ہیں۔ ایک نیا قاعدہ سمجھانے سے پہلے یہ کام کیے جاتے ہیں۔ اردو سیکھنے والے طلبہ سے اپنا حیالات " مجھے معلوم ہے، جاننا چاہتا ہوں، پتا چلا " کے طریقہ کے ذریعے پوچھا جاتا ہے: اسی موضوع پر کیا معلوم ہے؟ اس سوال کے اندر اپنی مادری زبان کی گرامر کا موازنہ کرتے ہیں -مثلاً شخص ضمیریں اور ضمیر اشارہ مشترک ہیں۔

نئی گرامر پر ایک یا دو مشقیں کلاس میں زبانی اور تحریری کی جاتی ہیں اور گھر کے کام کے طور پر زیادہ تر یہ رواج ہے کہ قاعدے پر مثالیں دی جائے اور ایک مشق تیار کی جائے۔ متن کے نئے الفاظ اور محاورے پڑھکر سنا دئے جائے۔ جن کا تلفظ مرکّب ہے ان پر عوز دیا جائے یعنی استاد ان کو کئی دفعہ پڑھ کے سناتا ہے اور طلبہ ان کو دہرا کر اپنا تلفظ درست کرتے ہیں- نیا متن ایم پی ٹری یا براہ راست بلند آواز سے پڑھایا جاتا ہے۔ ہوم ورک کے طور پر متن کو کئی بار پڑھنا اور اس کا ترجمہ کرنا دیا جاتا ہے۔

اگلے سبق میں متن کو واضح طور پر پڑھنا اور اس کے ترجمہ پر توجہ کرتے ہیں۔ متن کی لغوی اور قواعیدی مشقوں پر بھی زور دیتے ہیں۔ ہم اس میں نئی اور جدید طریقوں کا بھی استعمال کرتے ہیں۔ کچھ طلباء کو اردو کے بعض فعل، لفظ کے معنی یاد میں رکھنا اور ان کا فرق سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ اس عمل کو آسان بنانے کیلیے (ﻧ) TPR کا وسیع پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اردو کے افعال، رکھنا اور ڈالنا۔ بعضاً ان کا مفہوم گمراہ کن ہوتا ہے ?? تب طالب علم کو سپریش حرکتوں سے ان افعال کا معنی دکھا? جائے تو انھیں آسانی سے یاد کر لیتے ہیں۔ لغوی مہارت کو مضبوط کرنے میں روایتی طریقوں کے ساتھ ہم کلسٹر، extra find سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ گرامر تکل مشقوں کی بنیاد نئے قواعدوں پر مشتمل ہوتا جو متن سے تعلق رکھتی ہے۔ ان مشقوں کو اپنانیکے بعد متن کا جائزہلیا جاتا ہے۔ جب طلباء ل نئے موضوع کو تحریری طور پر اپنا لیتے ہیں تب ہی زبانی پریکٹس پر غور دیا جاتا ہے۔ یعنی موضوع پر سوال- جواب، بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ یہاں ایک بات قابل ذکر ہے کہ یہ سلسلہ پہلے استعمال کیا جاتا تھا، اب مطالبہ دوسرا ہے: غلط ہوا یا صحیح طالب علم اردو میں بولے۔ اس نقطہ نظر کی دو جہات ہیں: مثبت اور منفی۔ میرے خیال میں صحیح تقریر کی بنیاد گرامر ہوتی ہے۔ ہمارے ہندوستانی اساتذہ (پروفیسر خواجہ اکرام الدین، اخلاق آہن، انور پاشا اور دیویندر چوبے) ہمارے تعلیمی نظام سے واقف ہیں۔ ہر موضوع کے اختتام پر، یہ دو روایتی ٹیسٹ کام انتظام کیے جاتے ہیں: ایک نئے الفاظ پر، دوسرا نئی گرامر اور متن۔ اس میں ٹیسٹ یا کنٹرل کام شامل ہوتے ہیں۔ البتہ، اردو ہمارے لیے غیر ملکی زبان ہے، یہ فطری بات ہے کہ کنٹرل کام میں غلطیاں اور خامیاں ملتی ہیں، اور ان پر عملی طور پر کام کرنا یعنی غلطیاں دور کرنا سب سے اہم بات ہے۔

اوپر دیے ہوئے ٹیبلس سے معلوم ہے کہ زیادہ تر اسباق کا روایتی شکل میں انتظام کرجاتے ہیں۔ ہمارے نقطہ نظر سے روایتی کلاس تعلیمی نظام کا ستون اور تعلیم کے جدید طریقیاس کو زیب دینا چاہیے۔

استاد کو سب سے پہلے یہ طے کرنا پڑتا ہے کہ کونسے کورس میں کون سے طریقے کا استعمال کس طرح کیا جائے، مقصد کیا ہے؟

اوپر ہم نے پریکٹس کے آم طریقوں کے بارے میں بتایا آگے مرکّب نظام پر کچھ معلمات پیش کرینگے۔

متن کا پریکٹس تین اسٹیج پر مشتمل ہوتا ہے :(۸)

a) متن کو پڑھنے سے پہلے؛
b) متن کے اوپر براہ راست کام کرنا؛
c) متن کو پڑھنے کے بعد؛

اس قسم کا متن کا انتخاب کرنا ضروری ہے کہ طالب علم کو پوری کہانی میں دلچسپی رہے ،اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نتیجہ توقع کے مطابق نہیں ہوگا۔اس کے برعکس، اگر دلچسپی ہوتی تو الفاظ حفظ کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔

استاد کو سب سے پہلے یہاں تک توجہ کرنا ضروری ہے:

1) طلباء کو نہ صرف قواعد کے طور پر متن کا جائزہ لینا ہے بلکہ متن کا مفہوم صحیح سمجھنا اور متن کے اوپر اپنی رائی روانگی سے اظہار کرنا بھی ضروری ہے۔

2) لیکن متن کا انتحاب کرتے وقت یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کے یہ متن طالب علم کو کیا معنوی (سبق آموز) تعلیم دے سکتا ہے۔اس لحاظ سے متن پر مشقیں تیار کرنا مناسب ہے۔

اگر کلاس کا کام یا گھر کا کام آسان اور ہمیشہ کی طرح ہو تو سب سے دلچسپ اور دلکش متن بھی طلباء کو اپنی طرف کھینچ نہیں سکتا۔ برعکس ذرا سا مشکل متن جو طلباء ؁ کو غور و حوظ کرنے پر مجبور کرے اس کو من لگا کر اپنایا جاتا ہے۔یہ سبق میں مسابقتی ماحول پیدا کرسکتا ہے۔

متن کے نئے الفاظ، قواعدی شکلیں، اور تقریر کے نمونے مثبت خیالات سے بھرے ہوے ہوتے ہیں۔طالب علم کو ان میں سے کسی کو نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔یہ عمل بحث و مباحثہ کی اہم وجہ بن سکتا ہے۔

ٹیکسٹ پڑھنے سے پہلے اسٹیج کی اہمیت یہ ہے:

a) متن کو پڑھنے پر motivation پیدا کرنا؛
b) یہاں متن طلباء ؁ کے اب تک حاصل کردہ واقفیت پر مبنی ہونا چاہئے، متن کے واقعات پیش گوئی کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا؛
c) پڑھے ہوئے گرامر کے نمونے متن سے نکالکے ان کو (فرق) الگ کرنا؛
d) فعل کے زمانے اور فعل کے صیغوں کو صحیح تلاش کرنا؛
e) متن کے الفاظ بننے (بنیادی کے طور پر) کے نمونوں کی جانچ کرنا– طالب علم کو متن کا جائزہ لینے کے لیے تیار کرنا۔

اس کے لیے استاد کی نگرانی میں ان مندرجہ ذیل طریقوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

1. علم المعانی کی حیثیت سے الفاظ کی جانچ کرنا :
- دیے ہوئے لفظ کے لیے مرادف اور متضاد لفظ دینا؛
- جملے کی خالی جگہیں ضروری لفظ سے پر کرنا۔

2. الفاظ کی شکل کے مطابق الگ کرنا:
- گرامر کے مطابق متن طور پر گرامٹکل (ایک ہی پریفکس والے، لاحقہ والے اور مرکّب الفاظ) شکل متعین کرنا۔ان کو گروپ میں تقسیم کرنا اور ان کے استعمال کی حیثیت بھی سمجھانا چاہئے؛ ان سوالوں پر جواب کھڑا کرنا بھی ہے کہ الگ کیا گیا لفظ کس اسم کا ہے اور کس لفظ پر مشتمل ہے۔(یہ کس لفظ سے بنا ہے؟) (چھوٹے گروپ میں کام کرنا مناسب ہے)

3. تبدیلی کا طریقہ:
- دائرکٹ اسپیچ کو انڈائرکٹ اسپیچ میں تبدیل کرنا؛
- دو معمولی جملوں سے ایک مرکّب جملہ بنانا؛
- دیے ہوئے جملے کے مطلب کو دوسرے الفاظ سے اظہار کرنا۔

4. لغت کی مدد سے کام کرنا:
- تیزی سیکلیدی الفاظ کی تلاش کرنا؛
- مرکّب اسم، صفت اور فعل ترکیب کی تشریح؛
- متن کے لفظ کو لغوی شکل میں تبدیل کرنا۔(جو لفظ متن میں ملتا ہے اس کو بنیادی شکل میں تبدیل کرنا)

5. متن کا مفہوم اندازہ لگانا: متن کا عنوان ،اس کی ترتیب اور استاد کی تقریر- یہ سب متن کا خاص مضمون سمجھنے کا موقع دیتا ہے:
- متن کے نئے الفاظ کے معنی بغیر لغت کے سمجھ لینا؛
- ٹیکسٹ کا عنوان پڑھتے ہی اس کا بیان اردو میں کرنا (ٹیکسٹ کا نام پڑھتے ہی اردو میں بتا دینا چاہیے کہ یہ متن کس بارے میں ہے؟)
- پیراگراف کے پہلے 2-3 جملے پڑھکر اگلے کے بیان کی پیش گوئی کرنا۔

دوسرے اسٹیج کی اہمیت یہ ہے کہ متن پر براہ راستکام کیا جاتا ہے۔کنٹرول کا مقصد متن کی تفہیم کرنا۔اس میں متن کے مطلب اور ساخت اور ان کے ساتھ ساتھ زبان کے مواد کی تفہیم بھی لی جاتی ہے۔

1. الفاظ کے املا پر کام کرنا۔معلوم ہے کہ عربی - فارسی املا میں آوازیں اور حروف مشترکہ نہیں ہوتے ہیں، اکثر لفظ میں آواز حرف سے زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں ایک اصول ہے: چاہے کوئی طالب علم لفظ غلط تلفظ کرے تو اس لفظ کو لکھنے میں بھی غلطی طور کرتا ہے۔اس لیے تحریر پر سخت زور دینا چاہئے۔

2. تحریری املا۔استاد متن کے خاص قسم (اگر متن بڑا ہو) گھر

میں 3 بار ایک کاپی نقل کرنے کو دیتا ہے۔اس کے لیے الگ کاپی کا استعمال کیا جاتا ہے۔

3. متن کا مضمون کھولنا۔متن سے اس کے اصل معنی دینیوالے جملے الگ کرنا، ثانوی معلومات (متن کے مضمون پر نقصان کے بغیر) الگ لکھنا۔ استاد متن کا ایک حصہ تقسیم کرکے بانٹ دیتا ہے۔طلباء ـ صرف کلیدی الفاظ چھوڑ دیتے ہیں اور جملہ پور کرتے ہیں۔استاد بحث کے جوابات سامنے رکھتا ہے۔(چھوٹے گروپ میں جاری کیا جاتا ہے)۔

4. خالی جگہ پر کرنا۔استاد متن کو دوبارہ ٹائپ کرتے وقت متن میں جگہ جو بعض اسم یا فعل کے لیے مناسب تھی اسے خالی چھوڑ دیتا ہے اور طلباء ـ ان خالی جگہیں پر کرتے ہیں۔

5. متن کو پھر سے بنانا: مطلوبہ الفاظ سے جملہ بنانا: 10 جملوں کو 5 جملوں میں تبدیل کرنا۔استاد متن کے اقسام مکمل طور پر کاٹ کر تقسیم کرتا ہے۔ طلباء ـ اپنی منطقی تسلسل میں متن کے ٹکرے جمع کرتے ہیں (منی گروپ میں)۔(استاد یہاں کسی اور متن سے حوالہ دے سکتے ہیں)۔

6. متن کی معلومات کا خلاصہ نکالنا: ہر پیراگراف اور متن کی بنیادی کہانی کو واضح کرنے والیالفاظ الگ کرنا۔متن پر ایک مختصر خلاصہ لکھنا۔

تیسرا اسٹیج۔ متن کا مطالعہ اور جائزہلینے کے بعد کا اگلا قدم ہے۔اس اسٹج پر، بنیادی زور متن کے کلیدی عناصر کی نشاندہی پر ہے۔یہ طے کیا جاتا ہے کہ طالب علم متن کا مضمون تحریری اور زبانی شکل میں اپنی رائے کا اظہار کرسکیں۔لہذا، مشقیں تخلیقی اور ثمرآوار ہونی چاہیئے۔

1) پلاٹ بیان کرنے کی مشقیں: متن کے انتہائی اہم واقعہ یا قصّہ بیان کرنا۔متن کے کسی بھی واقعہ یا قصّہ کی اہمیت بتانا۔استاد متن کو 20–30 جملوں پر مشتمل ٹکڑوں میں تقسیم کرتا ہے۔طلباء ـ اسے 10 جملوں میں بیان کرتے ہیں۔("متن کی تخفیف")

2) کرداروں کی خصوصیت بیان کرنا: مصنف کے تبصروں کو الگ کرکے پیش کرنا؛ متن کے الگ قصّوں کے لیے سوال کھڑا کرنا۔ مصنف کے الفاظ سے ہیروؤ کا تبصرہ کرنا؛ ہر ایک طالب علم ہیرو پر اپنے نقطہ نظر بیان کرتا ہے۔(اگر آپ ہیرو کی جگہ پر خود ہوتے تو آپ کیا کرتے؟)

نتیجہ یہ ہے کہ متن کو پڑھنے کا بنیادی مقصد پڑھنا، اسے اور اس کا مفہوم سمجھنا ہے۔ پڑھنے میں طالب علم کی دلچسپی بڑھانے کے لیے مروج، یعنی صرف پڑھنیاور ترجمہ کرنے سے بچنا چاہیے۔اس مقصد کیلیے روایتی اور کچھ نئی ٹیکنالوجیز کو کام میں لانا چاہیئے۔متن کے انتخاب میں متن کے تعلیمی پہلو پر غور کرنا چاہیئے، کیوں کہ متن انسان کو ذہن نشین ہونے کی وجہ ہے۔ دوم، یہ نوٹ کرنا چاہیئے کہ اگر مذکورہ بالا گرامر متن سیمطلق ہے تو موضوع اور دلچسپ لگتا ہے۔

منزکرہ بالا طریقوں کو منتخب کرتے وقت پڑھنے والوں کی صلاحیت اور ان کی عمر پر غور دیا جاتا ہے۔

جمہوریہ ازبکستان ایک جوان آزاد ملک ہے۔تعلم وتدریس کے سلسلے میں تجربہ کار ہندوستان سے سیکھنا اور تعاون کرنا ضروری ہے۔اس کے واسطے میں جمہوریہ ازبکستان کے صدر کی دو خصوصی قراردادیں جاری ہیں (2909? ، 3151?)۔ان کو عمل میں لانے کے لیے جمہوریہ ازبکستان کے صدر کے "استعداد" نامی فانڈیشن کے زیراہتمام پر مجھے 2018 اگست میں ایک ماہ کے لیے JMI میں ٹرینگ کورس کرنے کا موقع ملا تھا۔اس ٹرینگ کورس نے مجھے متعدد کامیابیاں اور مواقع فراہم کیا:

میں نے اردو زبان کے شعبہ کے ممتاز اساتذہ سے علم اور تجربہ حاصل کیا، اور میں پروفیسر عبدالرشید کی شاگردہ بن سکی، جو میرے لیے فخر کی بات ہے۔

ہر ایک زبان زندہ ماحول ہے، بشمول اردو بھی۔اس میں وقتاً-فوقتاً تبدیلیاں اور اصلاحات ہوتی ہیں۔ٹرینگ کورس کے دوران، میرے استاد عبد الرشید نے مجھے اردو اصلاحات سکھائیں۔

اسی ایک ماہ کے دوران میں نے اردو زبان کی مشقوں کا ایک مجموعہ تیار کیا اور شائع کروایا۔

1) ہندوستان کے معروف "REKHTA" کی مدد سے اردو زبان کی درسی کتاب کے صوتی حصے پر ایم پی ٹری تیار کیا۔

2) ہمارے ہاں اردو کی تعلیم میں کامیابیوں کے ساتھ دشوار معالے بھی ہیں،:

3) اردو زبان پڑھانے میں درسی کتابوں کی کمی ہے۔ہم کو ہندوستانی اسکالرز کے تعاون سے 2–4 کورسز کے درسی کتاب شائع کروانے کا ارادہ ہے۔

اگرچہ ہمارے پاس ہندوستانی اسکالرز کے بہت ساری کتابیں موجود ہیں: اردو املا کی اصلاح، اردو صرف ونحو، آسان قوائد اردو، اصلاح تلفظ املا، آئینہ تلفظ، تحریر کیسے سیکھیں، سخت تلفظ، درست اردو املا سیکھیں)۔جیسی کتابوں کی پی ڈی ایف ہیں۔لیکن ازبک تعلیمی منصوبے کے نہ مناسب ہیں، اس کے ساتھ ساتھ یہ کتابیں ان لوگوں کے لیے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے۔ ہمارے نصاب میں مکمل طور پر فٹ نہیں ہے۔یہ حالت ہمارے لیے دشواری پیدا کرتی ہے۔ہم ہندوستانی اسکالرز کے ساتھ 2–4 کورسز کے اردو زبان اور اردو زبان کی تدریسی پر نصابی کتاب تالیف کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

1) ازبکستان میں پبلشنگ انڈسٹری اتنی ترقی نہیں پائی جتنی ہندوستان ہیں، خاص طور پر اردو میں درسی کتب کی تیاری اور اشاعت، کیونکہ اردو رسم الخط 3 عناصر سیمشتمل ہے۔ ہمارے ہاں کسی بھی پبلشنگ ہاؤس میں نہ تو کسی کو اردو آتی ہے نہ کوئی اردو دان وہاں ملتا ہے۔ اور ان میں تکنیکی صلاحیت (NASTALIQ،NOORIJAMEEL،INPAGE والا سوفٹویر) بہت سست ہے۔ہم نے جو کتابیں تیار کیں وہ برسوں سے شائع نہیں ہوتیں۔

2) ہمارے مشاہدات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہندوستان

میں کتابوں کے کاغذ اور جلد کی ماہیت اعلی درجے کی ہے۔ باتصویر درسی کتب کی اشاعت میں ہندوستانی ناشرین سے سیکھنے والی خوبیاں لاتعداد ہیں ۔

3) ایک اور ہمارا مقصد یہ ہے کہ اردو کے ماہرین کے ساتھ ہم ازبک طلباء ⁽ کے لیے اردو آڈیو ریکارڈنگ تیار کریں۔

میں اردو کے شائقین سے کہنا چاہتی ہوں: ہمارے شعبے میں 5 اساتذہ آج اردو پڑھاتے ہیں۔ علم کی ترقی کے لیے اردو میں کوئی جدید ٹریننگ کورس نہیں ہے ،اوراس طرح کے کورسز زیادہ مناسب رہتا ہے۔ جس کے نتیجے میں، پوری دنیا سے اردو کے اساتذہ اپنی صلاحیتوں کو بہتر بنانے کے لیے ہندوستان آسکتے ہیں۔

اردو پڑھنیوالے بی اے اور ام اے کے طلباء کے لیے ٹریننگ کا کورس کا انتظام کیا جائے تو مفید کام ہوگا۔ کہتے ہیں کہ زبان دل کے راستے کھول دیتی ہے۔ خیالات اور مقصد مشترک ہوں تو نیک اعمال کی فہرست کامل ہوتی ہے۔ ہم ازبکستان میں اردو کی تعلیم دینے میں ہندوستانی ماہرین کی مدد کی امید رکھتے ہیں۔

حواشی:

.1ادبی ترجمہ اور متعدد درسی کتب کے مصنف، ماہر، ممتاز اردودان

2اردو شاعری کا مترجم

3دونوں اردودان کئی درسی کتب، لغتوں کے مرتب اوراردو نگار ہیں

4اردو کی زبردست استانی

5یہ سرکاری طور پر تعلیم یافتہ طلباء ⁽ کی تعداد ہے، اس کے ساتھ ساتھ غیر رسمی اردو سیکھنے والے ہیں، کیونکہ اسلام کے زیادہ تر دینی وسائل اردو میں ہیں۔ اس لئے اردو میں اسلامی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

6پہلے سال کے طلباء ⁽ کے لیے 3 درسی کتاب (جس کے مرتب رحمٰن بیردی محمد جانوف ،محیا عبدالرحمنووا، مکتوبہ مرتضٰی خواجائیوا، امیدہ ذاکرووا ، محلصہ شاہ رہمتووا)، 1مشقوں کی کتاب (مکتوبہ مرتضٰی خواجائیوا)، "اردو ریڈر" (تاش مرزا خالمرزیف، مرحبا خال میرزیوا، اردو تالیف پرمحیا عبدالرحمنووا کی ایک درسی کتاب ، "اردو شاعری " (پروفیسر خواجہ اکرام الدین اور محیا عبدالرحمنووا(ہم قلم)) اور ہندوستان کے "REKHTA" فاؤنڈیشن کی مدد سے سننے اور سمجھنے کے لئے 1ایم پی ٹری تیار کئے گئے۔

7–response–TPRphysicaltotal تدریس وتعلیم کے جدید طریقوں میں سے ایک ہے جو یوروپ میں پیدا ہوا۔ اس میں پڑھنیوالے کو لفظ محسوس کرنی ہوتی ہے اوراس لفظکے معنی کو اپنی حرکتوں سے دکھانا پڑتا ہے۔ دیکھکر یاد مے رکھنے کا بہترین طریقوں مے سے ایک ہے۔

8ڈاکٹر محیا عبدالرحمانووا کے تبصرے کے مطابق

نظم

علی محمد فرشی

دعاؤں کی بدچلنی

ناقابلِ برداشت درد کو
کیسے سہنا چاہیے
گالی کی طرح
یا گولی کی مانند

خاموشی سے
گردن
ڈھلک جانی چاہیے
یا پھر
مرنے سے پہلے
باقی ماندہ قوت جمع کر کے
اُس منہ پر تھوک دینا چاہیے
جس سے گالی نکلی تھی
اور اس بندوق کو توڑ دینا چاہیے
جو گولیاں بکتی ہے

نوحہ کیسے لکھنا چاہیے
مطلب، پابند ہئیت میں یا آزاد
ایسے شاعر سے
معلوم کرنا چاہیے
جو مردہ علم کو نہیں چھوتا
اور چوری کی موت نہیں مرنا چاہتا ●●

نظمیں

علی محمد فرشی

مرض الموت سے محفوظ

محبت سے کوئی جگہ خالی نہیں
سوائے مٹی سے بھرے پیٹ کے
اور اُن آنکھوں کے
جو اندھیرے میں دیکھ لیتی ہیں
کالی دولت
جو ہماری نسلوں کی ہڈیاں بیچ کر جمع کی گئی
اور مرمریں میناروں والی مسجدوں میں
جو نفرتوں کی پناہ گاہیں بنا دی گئیں
وہ گھر، جس کی بنیادوں میں چوہوں نے بل بنا لیے

بندریا کے پاؤں جلنے لگے تو
اُس نے اپنا بچہ پاؤں تلے دبا لیا
جھیل خشک ہوگئی تو
موت مچھلیوں کی ضرورت بن گئی
کونج مردہ ساتھی سے پیوست ہو کر رہ گئی
حالانکہ اُس کے پر سلامت تھے
اور پیٹ بھرا ہوا
پروں میں لہو کی لہریں بے قابو ہو رہی تھیں
اور آسمان اُسے بار بار بلا رہا تھا
لیکن اُس نے مردار خور کیڑوں کی آواز پر کان رکھے
اور مٹی سے مٹی ہو جانے والی
محبت کے سینے پر سر رکھ کر
اپنی آنکھیں موند لیں ●●

بھوت حویلی

ایک خواب
دوسرے خواب کے اندر
کسی دروازے سے داخل ہوتا ہے
یا نیند کی دیوار پھلانگ کر
آ گھستا ہے
کسی شریر لڑکے کی طرح
اُس سنسان حویلی میں
جہاں بھوتوں کا بسیرا ہے

بھوت حویلی میں جانے کے لیے
اجازت کی ضرورت نہیں
نہ یہ کسی کی ملکیت ہے اور نہ اس پر کسی کا قبضہ
لیکن اس کی جانب جانے کے خیال سے
لوگوں کی جان جاتی ہے
حالانکہ بھوتوں نے کبھی کسی انسان کی جان نہیں لی
بھوتوں کا انکار کرنے والے بھی
اس طرف سے نہیں گزرتے

شریر چھوکروں کے لیے
حویلی محفوظ ترین جگہ ہے
ایسے تمام کھیلوں کے لیے
جنھیں گھروں، گلیوں اور میدانوں میں
نہیں کھیلا جا سکتا ●●

پروفیسر آل احمد سرور کی فکشن تنقید

ابوبکر عباد

پروفیسر آل احمد سرور کی ہمہ جہت شخصیت اپنی علمیت، ادبی بصیرت اور دانشوری کی وجہ سے گزشتہ چھے دہائیوں کے عرصے میں نمایاں رہی ہے۔ انھوں نے علمی اور ادبی دنیا میں اپنی موجودگی کا احساس اواخرِ عمر کے اس حصے میں بھی دلایا جس میں لوگ پڑھنے لکھنے، خط وکتابت اور دوسری سرگرمیوں سے کنارہ کش ہوکر خود کو ماضی کی یادوں یا حال کی محض چند رسمی ملاقاتوں تک محدود کرلیتے ہیں۔ سرور صاحب نے متعدد ادبی، تہذیبی اور تعلیمی اداروں میں تدریسی اور تنظیمی فرائض انجام دیے، کئی رسالوں کی ادارت کی، مختلف تحریکوں اور رجحانات سے وابستہ رہے اور کم از کم تین نسلوں کی ذہنی تربیت بھی کی۔

ایک نامور استاذ، بلند پایہ ادیب، اچھے شاعر اور قد آور نقاد کی بیشتر خصوصیات سرور صاحب میں موجود تھیں۔ چونکہ ان کی طبیعت میں ایک سیمابی کیفیت اور مزاج میں ایک طرح کا اضطراب تھا اس لیے تحقیق کی بوجھل، پُرسکون اور اکھری دنیا سے دور رہے۔ لیکن مختلف علوم وفنون سے آگاہی، حیرت انگیز یاد داشت، چیزوں میں فرق وامتیاز کی خوبی، مستند اور غیر مستند کی پہچان اور بنیادی مأخذ تک رسائی کی ان میں ایسی صلاحیتیں تھیں کہ محققین بھی ان پر رشک کرتے تھے۔

علمی دنیا میں سرور صاحب کی شہرت وناموری اور عزت واحترام کا باعث ان کی دوسری تحریروں اور صلاحیتوں کے مقابلے میں بطور خاص ان کی تنقیدی نگارشات بنیں۔ انھوں نے شاعری کی تنقید بھی لکھی، فکشن کی بھی اور نان فکشن کی بھی۔ لکھنا اس زمانے میں شروع کیا جب تنقید سے صرف شاعری کی تنقید مراد لی جاتی تھی اور شاعری کو بھی ناقدوں نے محض غزل تک محدود کر رکھا تھا۔ ایسا نہ تھا کہ خلاف رواج فکشن کی تنقید نہیں لکھی جارہی تھی، یقیناً لکھی جارہی تھی لیکن شاعری یا یوں کہیے کہ غزل کی تنقید کے سولھویں برس کے مقابلے میں فکشن کی تنقید کا تب بچپنا تھا۔ حیدرآباد والے پروفیسر عبدالقادر سروری ''دنیائے افسانہ'' نام کی کتاب لکھ کر فکشن کو گانے بجانے اور سوانگ بھرنے والے فنون کے زمرے سے نکال کر قدرے اونچی اور باعزت جگہ دلا چکے تھے، اِدھر مجنوں گورکھپوری بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اس موضوع پر دو خطبے دینے اور انھیں کتابی صورت میں شائع کروانے کے بعد فکشن تنقید کی اہمیت سمجھانے اور لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول کرانے میں مصروف تھے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ان دونوں حضرات کے بتائے ہوئے عناصر ترکیبی پر سید وقار عظیم نے افسانوں کے مختلف حصوں کو پرکھنا شروع کردیا تھا اور عبادت بریلوی اُن نئے ناقدوں کی صف میں شامل ہوکر ایک احساس تفاخر سے گزر رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اکیسویں صدی کے اِس دوسرے عشرے میں فکشن تنقید کی بلندی سے جب ہم ماضی کی طرف جھانکتے ہیں تو وقار عظیم فکشن کے ناقد سے زیادہ فکشن کے قاری نظر آتے ہیں اور عبادت بریلوی وہ بھی نہیں۔ سرور صاحب کا معاملہ ان دونوں حضرات سے قدرے مختلف اور ذرا آگے کا ہے۔ گو کہ انھوں نے فکشن کی تنقید مقابلتاً کم لکھی لیکن بہتر لکھی۔ اول تو یہ کہ سرور صاحب نے اردو تنقید کو عالمی تنقید کے لہجے سے متعارف کرایا اور گروہی تعصب وتحفظ کی جگہ مغربی تنقید کے توازن کو اختیار کیا۔ اگرچہ سرور صاحب سے بہت پہلے الطاف حسین حالی اور ذرا پہلے عبدالرحمٰن بجنوری اپنے اپنے طریقوں سے مغربی تنقید کو برت چکے تھے۔ لیکن حالی کے یہاں مغرب سے ماخوذ بعض تنقیدی اصطلاحوں میں ایک طرح کے گنجلک پن کا شائبہ اور بجنوری کے یہاں مرعوبیت نمایاں تھی۔ جب کہ ان کے برخلاف سرور صاحب کے تنقیدی برتاؤ میں خود افکاریت اور تناسب واعتدال کا احساس موجود ہے۔ دوسرے یہ کہ سرور صاحب نے کسی مخصوص فکر یا نظریے کی عینک استعمال کرنے کے بجائے تنقید کو بحیثیت تنقید دیکھنے اور اسے اصولی اور معروضی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی۔ اور تیسرے یہ کہ انھوں نے اس فن کے متن کو روایتی یبوست اور موضوعاتی خشکی سے نجات دلاکر زبان کی شگفتگی اور لہجے کی تازگی سے نکھارنے کی کوشش کی۔ نتیجتاً سرور صاحب کی تنقید میں کسی گروہ، روایت، رجحان یا تحریک کی گونج کے بجائے ان کی شخصیت کا رنگ وآہنگ کچھ یوں رچا بسا کہ ان کی تحریریں دُور سے پہچانی جانے لگیں، یا یوں کہیے کہ مصنف کے تعارف کا واضح شناخت نامہ بنیں۔ فکشن تنقید کے حوالے سے یوں تو ان کی کئی ایک تحریریں ہیں لیکن 'اردو میں افسانہ نگاری'، 'اردو ناول کا ارتقا'، 'پریم چند اور ہم'، 'بیدی کی افسانہ نگاری: صرف ایک سگریٹ کی روشنی میں'، 'نیا ادبی شعور'، 'موجودہ ادبی مسائل'، 'ولیم سمرسٹ مائم'، 'گورکی کا اثر اردو ادب پر'، 'لینن کا اثر اردو ادب پر' اور 'فکشن کیا، کیوں اور کیسے' قابل ذکر مضامین ہیں۔

سرور صاحب کی فکشن تنقید میں ایک تدریجی ارتقا اور حک واضافے کے ساتھ انکار ورجوع کا سلسلہ پورے عرصۂ تحریر کو محیط ہے۔ اس لیے صرف ان کے کسی ایک مضمون یا خیال کو بنیاد بنا کر کوئی دعویٰ یا قضیہ قائم کرنا نہ تو مناسب ہوگا نہ ممکن۔ اس سے انکار نہیں کہ ابتدا سے ہی ان کا شعور بالیدہ تھا لیکن تنقید میں اتنی پختگی نہ تھی، صلاحیتیں تھیں لیکن تب فکشن تنقید کے نئے ٹولس دریافت نہ ہوئے تھے۔ سرور صاحب کی خوبی یہ تھی کہ فکشن اور فکشن تنقید ترقی اور تبدیلی کے جن جن مراحل سے گزری انھوں نے نہ صرف انھیں قبول کیا، ان کے حسن وقبح کو جانچا بلکہ انھیں اپنی تحریروں میں برتا بھی۔ چنانچہ ان کے یہاں کسی طرح کے فکری جمود، شدت پسندی یا مفروضات پر اصرار کے بجائے ایک مسلسل سفر کی

اردو پروفیسر، دہلی یونیورسٹی، دہلی

کیفیت اور درویشانہ بیباکی کا انداز ہے۔ یہی صورت حال ان کے مختلف رجحانات ونظریات کے ردوقبول کی بھی رہی ہے۔ ممکن ہے بعض راسخ العقیدہ اور متشدد حضرات اُن کی اِس وسیع المشربی اور سیر چشمی کو جناب شیخ کے نقشِ قدم سے تعبیر کریں جو'یوں بھی ہے اور وُوں بھی۔' لیکن اسے کیا کہیے گا کہ چمن کے چپے چپے سے عشق کرنے والا کسی ایک رنگ یا ایک قسم کے پھولوں کا نہ تو طرفدار ہوسکتا ہے نہ اس پر قانع۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ شعروادب کی شریعت میں صرف ایک نظریہ، کوئی خاص رجحان، مخصوص تصور یا وحدتِ تعبیر پر ایمان رکھنے کے مقابلے میں کثرتِ تعبیر اور مختلف نظریات وتصورات کے اصنام سے شناسائی کا کافرانہ انداز زیادہ محبوب اور معقول ہے۔ سو، اس واویلے کی کوئی اہمیت نہیں کہ جمالیاتی نثر لکھنے والے سرور صاحب ترقی پسندی کے مغنی کیسے بن گئے، ہندوستان میں نئے آئے رجحان جدیدیت کی رہنمائی کیوں کی اور یہ کہ عمر کے آخری مرحلے میں مابعد جدیدیت کا مطالعہ کیسے کرسکتے ہیں۔ کسی ناقد سے یہ مطالبہ بھی جائز نہیں ہے کہ وہ صوفی کی طرح تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بجائے مفتی کے مانند بس ایک پہلو کو بنیاد بنا کر فتویٰ صادر کردے، یا وکیل کی مانند جزئیات پر بحث کرنے کے بجائے جج کی طرح آخری فیصلہ لکھ دے۔ شعروادب کی دنیا کا مفتی یا جج ہمیشہ سے قاری/سامع رہا ہے، ناقد نے جب جب اس منصب جلیلہ پر براجمان ہونے کی کوشش کی ہے تو خود بے اعتبار ہوا، قاری کو گمراہ کیا اور شعروادب کی دنیا میں زوال آیا ہے۔

سرور صاحب کی تمام تنقیدی تحریریں پڑھ جایئے، سطح پر آپ کو نہ تو کہیں فتوے کا رنگ دکھائی دے گا، نہ فیصلے کا آہنگ سنائی پڑے گا۔ اس کے باوجود ادب کا سنجیدہ اور حساس قاری یہ محسوس کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ بین السطور ان کے صوفیانہ رویے میں بھی مفتیوں کی سی ایک انا اور فاضل جج کے غرور کا شائبہ بہر طور موجود ہے۔ وجہ غالباً یہ ہے کہ وہ مغربی ادب وتنقید کے مقابلے میں اردو کے سرمایے کو بے مایہ نہ سہی کم مایہ ضرور سمجھتے تھے، نیز یہ بھی جانتے تھے کہ وہ صرف مشرقی ادب وتنقید سے ہی واقف نہیں مغربی سرمایے سے بھی پوری طرح باخبر ہیں۔ چنانچہ وہ جگہ جگہ مغربی ادیبوں اور تحریروں کا ذکر کرتے، ان کے حوالے دیتے اور تنقیدی محاکمے کے بعد ذاتی پسند وناپسند کا اظہار بھی کرتے ہیں۔

ہمارے کئی ناقدوں نے سرور صاحب کے پہلے مجموعے ''تنقیدی اشارے'' کو کافی سراہا اور اسے ان کی بہترین کتاب بھی قرار دیا ہے۔ جب کہ اس مجموعے میں ان کی تحریریں تنقید کی ابتدائی منزل پر ہیں۔ یہاں دلائل کی قوت پر جملوں کی شوخی ورنگینی حاوی ہے اور ناقد کی وسیع ادبی آگہی اور بصیرت خوش بیانی سے مغلوب نظر آتی ہے۔ مجموعے کا پہلا مضمون ''اردو ناول کا ارتقا'' ہے جس میں ڈپٹی نذیر احمد، پنڈت رتن ناتھ سرشار، مولوی عبدالحلیم شرر، مرزا محمد ہادی رسوا اور منشی پریم چند کے فن کے حوالے سے ناول اور ناول نگاروں پر گفتگو کی گئی ہے۔ انداز نقد کے مطالعے سے پہلے ان کی شگفتہ بیانی ملاحظہ کیجیے:

> ''داستانوں کو پڑھ کر آدمی مبہوت ہوسکتا ہے،
> قائل نہیں ہوسکتا۔ اس کا وقت اچھی طرح کٹ
> جاتا ہے، عاقبت نہیں سدھرتی۔ وہ کھو جاتا ہے،
> کچھ پاتا نہیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے زندگی
> اور اس کے مسائل کو بھول جاتا ہے، زندگی
> اسے نہیں بھولتی۔''

اب ناول اور ناول نگار سے متعلق یہ مختصر سا اقتباس بھی دیکھیے:

> ''یہ زندگی کی تصویر بھی ہے اور تفسیر بھی، خواب
> جوانی کی تعبیر بھی ہے اور سب سے بڑھ کر تنقید
> بھی، یہ ڈراما یا مضمون سے زیادہ مکمل ہے۔
> مضمون نگار زندگی کے متعلق اظہار خیال کرتا
> ہے، ڈراما نگار زندگی کو (شعلے کی لپک اور لہو کی
> دھار بنا کر) پیش کرتا ہے۔ مگر ناولسٹ زندگی
> کے چہرے سے نقاب اٹھاتا ہے''۔ (تنقیدی
> اشارے، اشاعت 1942، ص 2-1)

جب موضوعاتی اعتبار سے خشک، نامانوس اور غیر دلچسپ تنقید ایسی ستھری زبان، شگفتہ انداز اور سجل لہجے میں لکھی جائے گی تو بھلا کون پارسا ہوگا جس کا جی اس غیر محرم صنف سے آشنائی کو نہ چاہے گا۔ سرور صاحب نے اپنے اس مضمون میں 'مرأۃ العروس، توبتہ النصوح، فسانۂ آزاد، فردوس بریں، منصور موہنا اور 'امراؤ جان ادا' کی تنقیدی پرکھ کی ہے۔ اور حیرت نہ ہونی چاہیے کہ نقاد کے پاس الفاظ کی بُنت اور بات کہنے کا طریقہ دلکش اور جدید تو ہے لیکن جانچ اور پرکھ کے سانچے سب کے سب قدیم ہیں۔ وہی پلاٹ، ابتدا، وسط، تکمیل، کردار نگاری، منظر کشی اور مقصدیت وغیرہ۔ سو، وہ ناولوں کا معیار اُنھی رائج الوقت پیمانوں سے جانچتے اور ناول نگار کے قد کا تعین جدتِ موضوع، مشاہدے کی شدت اور حقیقت کے التباس سے کرتے ہیں۔ چنانچہ ان ناولوں اور ناول نگاروں کا محاکمہ کرنے کے بعد سرور صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہاں تک کوئی ایسا نہیں ہوا جسے اول درجے
> کا ناول نویس کہا جا سکتا، لیکن عین حالت
> انتظار میں اس برادری میں پریم چند کا داخلہ
> ہوتا ہے، جو اردو ناول کو وسعت، بلندی اور
> گہرائی عطا کرتے ہیں۔ پریم چند صرف مختصر
> افسانے لکھنے میں ہی کمال نہیں رکھتے بلکہ وہ
> بہت بڑے ناول نویس بھی ہیں۔'' (تنقیدی
> اشارے، اشاعت 1942، ص 8)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> ''چوگان ہستی، گوشۂ عافیت، پردۂ مجاز، نرملا،
> غبن، میدان عمل اردو کے بہترین ناولوں میں
> شمار کیے جاسکتے ہیں۔''

حیرت تب ہوتی ہے جب فنی طور پر نک سک سے درست 'امراؤ جان ادا' اور خود پریم چند کے ناول 'میدان عمل' اور 'گئودان' کے مقابلے میں سرور صاحب 'چوگان ہستی' کو اردو کا بہترین ناول قرار دیتے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو دیکھیے

اوپر کا اقتباس ختم ہوتے ہی یہ جملہ شروع ہوتا ہے: ''اگر مجھے اجازت دی جائے تو میں کہوں گا کہ 'چوگان ہستی' اردو کا بہترین ناول ہے۔''
یہاں سرور صاحب کے خیال سے تو اختلاف کیا جا سکتا ہے، ان کے تنقیدی رویّے پر اعتراض نہیں کہ یہ کوئی تنقیدی فیصلہ نہیں قاری کی اجازت سے محض ذاتی پسند کا اظہار ہے۔ لیکن دوسرے ناقدوں کی طرح ان کی یہ پسند اور رائے نہ تو حتمی ہے نہ دائمی۔ اپنے بعد کے ایک مضمون ''پریم چند اور ہم'' میں پریم چند کے ناولوں اور اس حوالے سے اپنی رائے کا از سرِ نو جائزہ لیتے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

> ''پریم چند کے یہاں انفرادی تجربے میں باوجود جذباتیت کے حقیقت کی جھلکیاں ملتی ہیں اس لیے میں ان کے ناولوں کی قدر کرتا ہوں، گو میرے نزدیک اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے یا ایک قسم کی جھجک کی وجہ سے وہ (پریم چند) سمندر کے کنارے تو آ جاتے ہیں مگر سمندر میں کودنے سے ہچکچاتے ہیں۔ 'بازارِ حسن' یا 'سیوا سدن' میں یہی کمی رہ گئی ہے۔ پھر ان میں تنظیم کی بھی کمی ہے جو طول کلامی سے باز رکھتی ہے۔ ''چوگانِ ہستی'' میں بھرتی کا احساس جا بجا ہوتا ہے۔'' (فکر روشن، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1995 ص 186)

یہ تو نہیں معلوم کہ شعر و ادب اور تنقید کی دنیا میں تبدیلی وارتقا اور نئے تصورات و رجحانات کو خوش آمدید کہنے والے سرور صاحب ذاتی زندگی میں اپنے اس خیال پر کب تک قائم رہے، لیکن تحریری حوالے سے 1973 میں لکھے ایک مضمون ''فکشن کیا، کیوں اور کیسے'' میں ان کے مذکورہ تمام خیالات کی یکسر تبدیلی کا واضح اعلان موجود ہے۔ اب وہ 'امراؤ جان ادا' کو اردو پہلا ناول مانتے ہیں، چوگان ہستی کے بجائے گئودان اور میدان عمل کو پسندیدہ ناول بتاتے ہیں اور پریم چند کو عظیم ناول نگار ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> ''واقعہ یہ ہے کہ اردو کا پہلا ناول 'امراؤ جان ادا' ہے۔ پریم چند نے جو دراصل افسانہ نگار تھے کچھ اچھے ناول لکھے اور ناول کی روایت کو آگے بڑھایا اور اسے وسعت بھی عطا کی۔ مگر وہ عظیم ناول نگار کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ ان کے اچھے ناول میدان عمل اور گئودان ہی ہیں۔'' (نظر اور نظریے، دوسرا ایڈیشن، دسمبر، 1982 ص 57)

یوں تو گئودان کے تمام کرداروں کی تعریف کی گئی ہے لیکن ہوری کو اردو ناول کا عظیم کردار مانا گیا ہے۔ پروفیسر ممتاز حسین کو اس پر یہ اعتراض تھا کہ ''ہوری پریم چند کے اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے تو یقیناً عظیم ہے لیکن وہ منشی پریم چند کے انقلابیت کے نقطۂ نظر سے یا سماجی انقلاب کے نقطۂ نظر سے عظیم نہیں ہے۔'' سرور صاحب اس خیال کو یہ کہہ کر رد کرنے کے بعد کہ فن کسی سیاسی نظریے کی صراط مستقیم پر نہیں چلتا، ہوری کے کردار سے متعلق اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں: ''میرے نزدیک پریم چند نے ایک نمائندہ کسان کی تصویر کھینچی ہے جو اپنے تضادات کے باوجود جاندار، روشن اور عظیم ہے۔'' (پریم چند اور ہم، مشمولہ، فکر روشن، 1995 ص، 186) اسی مضمون میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں: ''جو زندگی اور جان پریم چند کے کسانوں اور نچلے متوسط طبقے کے کرداروں میں نظر آتی ہے وہ ان کے اوپر کے درجہ کے کرداروں میں نظر نہیں آتی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ چند کو چھوڑ کر پریم چند کو مسلمان کرداروں کو سلیقے سے برتنا نہ آیا۔''

یہاں یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ سرور صاحب نے اپنے پہلے مضمون ''اردو ناول کا ارتقا'' میں جن ناولوں کے جو جو محاسن و معائب کا اجمالاً ذکر کیا تھا وہ بعد کے کئی ناقدوں کی کتابوں اور مقالوں میں تفسیر کی صورت بیان ہوتے آئے ہیں۔ افسانوں کے حوالے سے 1940 میں ان کا ایک مضمون 'اردو میں افسانہ نگاری' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس میں پہلے وہ مختصراً رومانی افسانوں کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار اور پھر تفصیل سے ترقی پسند افسانوں کے متعلق گفتگو کرتے ہیں۔ رومانی کہانیوں کو وہ افسانے سے زیادہ ایک خاص قسم کی انشا پردازی اور صناعانہ پختگی قرار دیتے ہیں اور ان کے نمائندہ افسانہ نگاروں پر خود پسندی، انانیت اور ایک نوع کی ذہنی تعیش کا لیبل لگانے کے بعد یہ جملہ لکھتے ہیں: ''انھوں نے اپنے جنسی میلانات سے سارے ادب کو جذبات کی دلدل بنا دیا تھا۔''
یہ لہجہ محض سرور صاحب کا نہیں، ترقی پسند سرور صاحب کا ہے، لیکن کسی بھی نظریاتی وابستگی کو انھوں نے کبھی عقیدہ نہیں بننے دیا سو، ان کی شخصیت کا توازن اور ان کی معروضیت یہاں بھی قائم ہے۔ اسی مضمون میں ترقی پسندی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''ترقی پسند رجحانات غزل میں تو مردنی اور کثافت لائے مگر نام نہاد ترقی پسند افسانہ میں طوائفوں اور عصمت فروشوں کی زندگی سے جو آب و رنگ پیدا ہوا وہ حقیقت نگاری کے لیے ضروری ٹھہرا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ ترقی پسند تحریک نے افسانے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچایا دراصل اس تحریک نے افسانہ نگاری کو آگے بڑھایا۔'' (مشمولہ، تنقیدی اشارے، اشاعت 1942، ص 25)

اس کے بعد وہ یہ بتاتے ہیں کہ کس طرح ترقی پسند دور کے افسانوں میں افراط و تفریط سے کام لیا گیا اور یہ کہ اس نوع کے بہت سے

افسانوں کی حیثیت تخلیقی فن پاروں کے بجائے معاشی اور سیاسی مقالوں کی طے پاتی ہے۔ وہ احمد علی، اختر حسین رائے پوری اور علی عباس حسینی کے بعض افسانوں پر سخت تنقید کرنے کے علاوہ اس تحریک کے دو اہم اور سرگرم رکن کے افسانوی مجموعوں سے متعلق لکھتے ہیں:

> (سردار) جعفری کی ''منزل'' یا رشید جہاں کی ''عورت'' دونوں مجموعے فنی خامیوں کا پتہ دیتے ہیں۔ ان میں فارم کا احساس عام طور پر مفقود ہے اور ان کی نظر بہت گہری نہیں ہے۔'' (ایضاً، ص 26)

البتہ انھوں نے بیدی کے فن اور ان کے افسانوں کی تعریف کی ہے اور وہ ان کی فنکاری کی متعدد خصوصیات کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ بیدی کے افسانوں کا بنیادی حوالہ عورت اور المیہ بیان ہے۔ سرور صاحب لکھتے ہیں: ''بیدی عورت کو نہ تو ایک خواب مرمریں سمجھتا ہے اور نہ جنسی جذبات کی نکاسی کا آلہ... ان کا قصہ الم انگیز ہے، مگر بیدی کے انداز بیان سے آنسو خشک ہو جاتے ہیں اور دلوں میں ایک خاموش عزم پیدا ہو جاتا ہے۔'' بیدی کی فنی خصوصیات کی توسیع وہ اپنے ایک اور مضمون ''بیدی کی افسانہ نگاری: صرف ایک سگریٹ کی روشنی میں'' میں کرتے ہیں۔ پریم چند کی آدرش حقیقت نگاری کے مقابلے میں بیدی کی حقیقت نگاری کو انھوں نے نفسیاتی حقیقت نگاری کہا ہے، جس میں عمل یا روئداد کا حصہ زیادہ نہیں ہوتا لیکن ذہن میں بہت کچھ ہوتا رہتا ہے۔ جس زمانے میں ہمارے بعض ناقدین بیدی کی زبان پر اعتراض کر رہے تھے اور اس کے نقائص گنوا کر افسانے کی خامیوں میں شمار کر رہے تھے تو غالباً سرور صاحب پہلے شخص تھے جنھوں نے معترضین کو افسانے اور شاعری کی زبان کے فرق سے نابلد بتاتے ہوئے بیدی کی زبان کا یہ کہہ کر دفاع کیا تھا: ''افسانے میں شعریت ہوتی ہے مگر افسانے کی زبان شاعرانہ نہیں ہونی چاہیے۔ یہ افسانے کے موضوع، موقع اور محل کے مطابق ہونا چاہیے۔'' حیرت زا دلچسپ بات یہ ہے کہ سرور صاحب کے ان دونوں مضامین کی بازگزشت نہ صرف بیدی پر بعد میں لکھے گئے مقالات و مضامین میں واضح طور پر سنائی دینے لگی بلکہ بیدی کے یہاں دیومالا اور اساطیر کو مرکزی حوالے کی حیثیت سے پیش کرنے والے بعض سربرآوردہ نقادوں کے اونچے تنقیدی محل بھی دراصل سرور صاحب کی دریافت شدہ بنیاد پر کھڑے ہیں۔ سرور صاحب کے مضمون ''بیدی کی افسانہ نگاری: صرف ایک سگریٹ کی روشنی میں'' سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

> ''ان (بیدی) کے یہاں شروع سے جذبات کی تیزی و تندی کے بجائے خیالات اور واقعات و تجربات کی ایک دھیمی لہر ملتی ہے جس کے پیچھے ایک گہرا فلسفیانہ احساس ہے مگر بیدی فلسفہ یا سیاست نہیں بگھارتے۔ اسی وجہ سے شاید منٹو نے کہا تھا کہ بیدی تم سوچتے بہت ہو۔ چنانچہ پریم چند کی آدرشی حقیقت نگاری جو کرشن چندر کے یہاں ایک رومانی حقیقت نگاری نظر آتی ہے، بیدی کے یہاں ایک ایسی حقیقت نگاری بن جاتی ہے جو اسطور اور دیومالا کے سایوں کی وجہ سے حقیقت سے کچھ بڑی اور پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔'' (مشمولہ فکر روشن، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 1995 ص 191)

شاید یہاں اس حقیقت کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے کہ بیدی کے افسانوں کا قرار واقعی اور سنجیدگی کے ساتھ جائزہ سب سے پہلے سرور صاحب نے ہی لیا تھا۔

''نئے اور پرانے چراغ'' میں شامل ان کا مضمون ''نیا ادبی شعور'' فکشن اور شاعری دونوں کا احاطہ کرتا ہے۔ بقیہ تحریروں کے برخلاف اس مضمون میں سرور صاحب کا لہجہ قدرے سخت اور مزاج کی شدت خاصی نمایاں ہے۔ بالخصوص جب وہ ادب میں جنسیات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں۔ اس اقتباس کو توجہ سے پڑھنا چاہیے:

> ''ایک عریاں افسانہ لکھ کر ایک لاشعوری کیفیت کو بیان کر کے یہ سمجھنا کہ ہم اعلیٰ ادب کی تخلیق کر رہے ہیں۔ کم بصری اور نادانی سمجھتا ہوں۔ میں عصمت، منٹو اور اس قبیل کے دوسرے افسانہ نگاروں اور میراجی، مخمور جالندھری، مجید بھٹی جیسے شاعروں کو ادب کا پنساری سمجھتا ہوں، جو ہلدی کی گانٹھ پر اترا تے ہیں۔'' (نئے اور پرانے چراغ، 1946، ص 380)

اقتباس میں اُن کے لہجے کی تلخی اور مزاج کی شدت کافی نمایاں ہے۔ جب کہ پہلے ایسا نہ تھا۔ 1940 کے ایک مضمون ''اردو میں افسانہ نگاری'' میں عصمت کے اسی نوع کے افسانے ''نیرا'' کی وہ جی کھول کر تعریف کر چکے تھے۔ البتہ منٹو سے متعلق اپنے سخت رویے کی تلافی اپنے کافی بعد کے مضمون ''فکشن کیا، کیوں اور کیسے'' میں اس طرح کرتے ہیں:

> ''ہمارے یہاں پریم چند، بیدی، عصمت، کرشن چندر، قرۃ العین اور اس دَور کے بہت سے افسانہ نگاروں کے قابل قدر کارناموں سے کیسے انکار ممکن ہے۔'' (نظر اور نظریے، 1973، ص 92)

اسی مضمون کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے جس میں منٹو کی اہمیت تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ نظریاتی شدت پسندی کے حوالے سے ترقی پسندوں پر لطیف طنز بھی کیا گیا ہے:

> ہماری تنقید میں نظریے کی آمریت بہت زیادہ

ہے۔ مارکس کو ماننے والے فرائڈ کو مشکل سے ماننے پر تیار ہوتے ہیں۔ وہ تو وجودیت کے روزافزوں اثر کو بھی تسلیم نہیں کرتے۔ زندگی کی طرح فن میں بھی حقائق سے آنکھیں چرانا خطر ناک ہے، مثال کے طور پر بیدی کی عظمت کا اعتراف ہوا ہے۔ مگر کما حقہ اعتراف نہیں ہوا۔ اور منٹو جس پائے کا فنکار ہے اس کی طرف اس کے ادبی موضوعات سے شغف کی وجہ سے بیشتر نقادوں کا دھیان ہی نہیں گیا۔'' (نظر اور نظریے، ایڈیشن، 1973، ص، 93)

ایک اور مضمون ''اردو میں ادبی تنقید کی صورت حال'' میں لکھتے ہیں: ''منٹو کی عظمت کا ابھی پورا احساس نہیں ہوا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے چند جنسی مسائل کی دلچسپی کی وجہ سے اس کی حیرت انگیز فنی صلاحیت اور اس کی جدید اور جاندار زبان کی طرف ابھی لوگوں کی نظر نہیں پڑی ہے۔'' (نظر اور نظریے، مکتبہ جامعہ، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن، 1982 ص 114) حیرت کی بات یہ ہے کہ منٹو سے متعلق اپنے ابتدائی خیال سے رجوع اور اِن تمام اعترافات کے باوجود خود سرور صاحب نے منٹو پر کوئی مضمون نہیں لکھا، نہ کہیں ان کے فن کا تفصیلاً یا اجمالاً جائزہ لیا۔

اردو ادب پر روسی ادیبوں کے اثرات کے حوالے سے سرور صاحب کے دو مضامین ''گورکی کا اثر اردو ادب پر'' اور ''لینن کا اثر اردو ادب پر'' خاصے اہم اور لائق مطالعہ ہیں۔ یہ مضامین انّیس سو چھتّیس کے بعد کے فکشن کی سمت و رفتار کی تعیین اور اس عہد کے تخلیق کاروں کے تصورات و نظریات اور فکری سر چشموں کو سمجھنے کے علاوہ سرور صاحب کے شعورِ نقد اور ان کے ادبی نظریے کی تفہیم میں بھی معاون ہیں۔

گورکی کا نام انیسویں صدی کی تیسری دہائی کے وسط میں ہندوستانی رسائل کے صفحات پر نظر آنے اور اردو ادیبوں کے ذہنوں میں نقش ہونے لگا تھا۔ گورکی کے انتقال سے ذرا پہلے منٹو نے روسی افسانے کے نام سے چیخوف، ترگنیف، سلوگب، افانسیف، ٹالسٹائے اور گورکی وغیرہ کے ترجمے شائع کیے تھے، جس کے مقدمے میں مشہور انقلابی مصنف باری علیگ نے لکھا تھا:

''گورکی کا قلم اس وقت مخالف قوتوں کے خلاف مصروف پیکار ہے۔ اشترا کی روس میں لینن کے بعد گورکی کی قابل احترام شخصیت ہے۔ جس طرح انیسویں صدی میں ہوگو کے افکار نے نوجواں قلوب پر قبضہ جما رکھا تھا اسی طرح بیسویں صدی کا نوجوان گورکی کے افکار و آراء اور فلسفے سے مسخر ہو چکا ہے۔'' (مقدمہ، روسی افسانے، ص ۱۱)

اردو میں فکشن نگار گورکی کے فنی ٹریٹمنٹ سے جو لوگ متاثر تھے یا ان کے فکر و فلسفے کو ناول و افسانے کے قالب میں ڈھال رہے تھے؛ ان میں سرور صاحب نے، پریم چند، کرشن چندر، اختر حسین رائے پوری، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، شوکت صدیقی اور علی سردار جعفری کے نام لیے ہیں۔ گرچہ ان میں سے بعضوں نے خود گورکی سے اثر قبول کرنے کا اعتراف کیا ہے۔ مثلاً بیدی کا یہ کہنا کہ ''میں نے کردار نگاری میں گورکی کا بھی اثر قبول کیا ہے۔'' منٹو کے بارے میں سرور صاحب نے لکھا ہے کہ: ''گو منٹو کی افتادِ ذہنی اسے بالآخر اسے ایک خاص سمت میں لے گئی مگر اس نے حقیقت نگاری اور سماجی طنز کا گُر گورکی سے ہی سیکھا۔'' شوکت صدیقی کے چند آوارہ کرداروں پر گورکی کے tramps کے نقوش بتاتے ہیں، کرشن چندر سے متعلق لکھتے ہیں کہ انھیں گورکی کے ہیرو اس لیے پسند ہیں کہ وہ غریبی اور پستی میں زندگی بسر کرنے پر قانع نہیں بلکہ ان کے خلاف بغاوت کرتے ہیں اور مختلف اور بہتر بننے کی امید رکھتے ہیں۔ پریم چند نے گورکی کی وفات پر اپنی علالت کے باوجود ایک مضمون لکھ کر انھیں خراج عقیدت پیش کیا تھا اور ان کے تعزیتی جلسے میں بھی شریک ہوئے تھے۔ کہ خود پریم چند اپنے آخری زمانے میں گورکی سے کافی متاثر تھے۔ بقول سرور صاحب: ''پریم چند کے یہاں 'گوشۂ عافیت' سے 'گئو دان' کی منزل تک خاصی نمایاں تبدیلی نظر آتی ہے۔ ٹالسٹائی اور گاندھی سے متاثر آدرشی حقیقت نگاری کا علمبردار 'گئو دان' اور 'کفن' تک پہنچتے پہنچتے زندگی کے بے رحم حقائق سے آنکھیں چار کرنے لگتا ہے۔ اس دور میں اس پر گورکی کا اثر بالکل واضح ہے۔'' 1936 والی ترقی پسندوں کی کانفرنس میں پریم چند کے خطبۂ صدارت پر بھی وہ گورکی کا اثر دیکھتے اور اس نعرے کہ ''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا'' کو اس کی نمایاں مثال بتاتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ تب فکشن نگار صرف گورکی سے ہی نہیں بلکہ چیخوف، موپساں اور فرائڈ سے بھی اثر قبول کر رہے تھے اور فن پاروں کو الگ الگ رنگ و آہنگ میں خلق بھی کر رہے تھے۔ اس حوالے سے ممتاز شیریں کا مضمون ''مغربی افسانے کا اثر اردو افسانے پر'' کہیں زیادہ اہم، عمدہ اور تجزیاتی اور تقابلی اعتبار سے زیادہ مستند ہے۔ جس میں انھوں نے بیدی پر چیخوف، منٹو پر موپساں اور قرۃ العین حیدر پر ورجینیا وولف کے نمایاں اثرات کی دریافت کی تھی۔ سرور صاحب کی ایک تو یہ بات اہم ہے کہ ''اردو افسانے میں تلخی اور طنز گورکی کے اثر کی نشاندہی کرتی ہے۔'' اور دوسری ان کی یہ شکایت کہ ہمارے بعض ادیبوں اور ناقدوں نے گورکی کے مقابلے میں چیخوف کی عظمت کو نظر انداز کیا۔ ان کا خیال ہے کہ ہمارے یہاں گورکی کی مقبولیت بلند پایہ ادیب کی حیثیت سے اتنی زیادہ نہیں ہوئی جتنی انقلاب روس کے ایک نقیب کی حیثیت سے انھیں دی گئی۔ اس مضمون میں سرور صاحب گورکی کے فن کو پوری طرح سراہنے کے باوجود ان کے اور ان کے پیرو کاروں کے اشترا کی حقیقت اور سماجی ادب کے تصور کو مکمل ادب ماننے سے انکار کرتے ہیں۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''عظیم ادب کا خاصا حصہ وہ بھی ہے جس کی سماجی Relevence یا تو بہت کم ہے یا

بالکل نہیں ہے۔ سماجی ادب ادب کی ایک قسم ہے، اور اگر ہم ادب کو صرف زندگی کی نقالی اور خاص طور پر اجتماعی زندگی کی نقالی ہی نہیں مانتے تو پھر اس کی اتنی مرکزی حیثیت بھی نہیں رہتی۔ ہاں کسی خاص دور میں اس کی اہمیت ہوسکتی ہے اور ہوئی ہے۔'' (نظر اور نظریے، ص232)

'لینن کا اثر اردو ادب پر' میں شعر وتنقید سے بحث کی گئی ہے۔ بنیادی حوالہ لینن کی شخصیت، اس کے فکر اور شعر وادب سے متعلق اس کے اکھرے رویے اور بعض سخت فیصلوں کو بنایا گیا ہے جس کا اثر ترقی پسند تحریک اور اس کے بعض شاعر وادیب اور ناقدوں نے قبول کیے۔ یوں تحریک کے حوالے سے ضمناً افسانوی ادب کا ذکر بھی آ گیا ہے۔ سرور صاحب نے اس مضمون میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اپنے عہد کی سب سے فعال اور جاندار تحریک کے نامقبول اور بے عمل ہونے کی ایک اہم وجہ یہ تھی کہ اس کے مصنفین نے ادبی نظریہ سازوں کے بجائے لینن کے غیر ادبی فکر اور اعلانات کو اپنا مطمحِ نظر بنایا اور اس کی تقلید پر شدت سے اصرار کیا۔ لکھتے ہیں: ''چھٹے دہے میں ترقی پسند تحریک اس لیے بے جان ہوگئی کہ اس نے اینگلز کے اس تصور کو تو نظر انداز کر دیا کہ ''ہر موضوع کو کسی مخصوص عمل یا صورت حال سے خود بخود نمو پذیر ہونا چاہیے نہ کہ اسے اوپر سے مسلط کیا جائے۔ اور اس کے برعکس لینن کے نظریات سے غیر مشروط طور پر وابستہ ہوگئی۔'' اور شاید اس اعادے کی ضرورت نہیں کہ لینن صرف دوٹوک، براہ راست اور خط مستقیم کے شعر وادب کو سمجھتا تھا، ہیئت وفارم کے تجربے اور علامت پسند اور مستقبلیت پسند شاعر وادیب اسے پسند نہ تھے۔ اور حد تو یہ ہے وہ ٹالسٹائے اور دوستویفسکی کو بھی وہ سخت ناپسند کرتا تھا، گوکہ اپنے سیاسی اغراض کے لیے اس نے ٹالسٹائے پر چھ مضامین لکھے جسے ادبی تنقید کی اچھی مثال نہیں کہا جاسکتا۔ یہ اقتباس دیکھیے جس میں لینن کے شعر وادب کے تصور سے متعلق سرور صاحب کی ناپسندیدگی نمایاں ہے:

> ''فشر یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ ''لینن ٹالسٹائی کو اس لیے نہیں معاف کر سکا کہ وہ (یعنی ٹالسٹائی) لینن نہیں بن سکا تھا۔'' گورکی کے نام 1911ء کے ایک خط میں لینن نے لکھا: ''ٹالسٹائی اپنی مجہولیت، انارکیت، پاپولزم (populism)، اپنے عقیدے (مذہب) کی وجہ سے معاف نہیں کیا جاسکتا۔'' (نظر اور نظریے، ص245)

اب دوستویفسکی سے متعلق یہ اقتباس بھی پڑھ لیجیے:

> ''آخر دوستویفسکی کے لیے لینن کی ناپسندیدگی کا جواز کیا ہے؟ 1904ء میں لینن نے داروسکی سے یہ کہا کہ ''وہ ان فضولیات کو پڑھنے کے لیے وقت نہیں رکھتا، اِس سے اُسے مل ہی کیا سکتا ہے؟'' کیا یہ اشارہ دوستویفسکی کے مذہبی عقائد یا اس کی قنوطیت، یا اس کے وجودی طرز فکر، یا اس کی نفسیاتی بصیرت یا اس کی اضطرب زدہ روح کی طرف ہے؟ اور کیا یہ ایک معنی خیز واقعہ نہیں ہے کہ اردو کے ممتاز ترقی پسند نقادوں نے لینن کے نظریہ ادب کے اثر سے عام طور پر دوستویفسکی کو نظر انداز کیا۔'' (ایضاً ص247)

آسکر وائلڈ نے فنی صداقت سے متعلق کہا تھا کہ ''فن میں سچائی وہ شے ہے جس کی ضد بھی سچائی ہو۔'' لیکن لینن ادب کے اس تصور کو کبھی قبول نہیں کرسکا۔ 1905 میں لینن نے پارٹی کی تنظیم اور پارٹی کے ادب پر اپنے مضمون میں یہ اعلان شامل کیا کہ ''ادب کو صرف پاٹی کا ادب ہونا چاہیے، پارٹی کے ادب میں یقین نہ رکھنے والے (غیر جانبداروں) کا ناس ہو! ادب میں فوق البشر کا نظریہ رکھنے والوں کا ناس ہو! ادب کو پرولتاری (محنت کش عوام) طبقے کے عام مقاصد کا ایک حصہ بننا ہوگا۔'' (بحوالہ نظر اور نظریے، ص248) شاید یہی وجہ ہے کہ عصمت چغتائی جیسے ادیبوں میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ سماج کے اونچے طبقے کی عکاسی کرنے والے ادیبوں کی مذمت کی جانی چاہیے۔ جس کی واضح مثال قرۃ العین حیدر پر ان کی تحریر ''پوم پوم ڈارلنگ'' ہے۔

سرور صاحب اپنے اس مضمون سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ لینن تاریخ کی ایک عظیم شخصیت، نوع انسان کا سچا بہی خواہ اور ایک انقلاب کا معمار ہے جس کے سیاسی نظریے سے علامہ اقبال، منشی پریم چند اور مولانا حسرت موہانی جیسے لوگ متاثر ہوئے، لیکن یہ باتیں لینن کو ادبی فیصلے کرنے کا حق نہیں دیتیں، اور نہ یہ کہ ادب سے متعلق اس کے نظریات بھی بلا سوچے سمجھے قبول کر لیے جائیں۔ مضمون ان سطروں پر ختم ہوتا ہے:

> ''ادب در اصل اس سچائی کے سرمائے میں اضافے کی کوشش کا نام ہے جو ہمیں میسر آسکتی ہے۔ ہم اسی صورت میں معنی خیز طور پر یہ اضافہ کرسکتے ہیں جب ہم کسی خاص سیاسی آئیڈیالوجی سے وابستہ نہ ہوں بلکہ پوری زندگی سے، اس کے سارے عجوبوں (paradoxes) سے، اس کے حسن اور اس کی بدصورتی سے، اس کے تضادات، اس کے معموں اور اس کے مسائل سے وفادار رہیں۔ ادب کے ہر جامع تصور میں نہ صرف مارکس کو بلکہ فرائڈ کو بھی، نہ صرف بریخت کو بلکہ بیکیٹ کو بھی ایک با عزت مقام ملنا

چاہیے۔"(ص،249)

ظاہر ہے سرور صاحب کسی نظریاتی وابستگی کو غلط نہیں سمجھتے لیکن شعروادب کوفنی اصولوں پر پرکھنے کے بجائے اسے خالص سیاسی نظریے کی میزان پرتولنے، یا اسے ایک ہی رنگ میں دیکھنے کی سخت مخالفت کرتے ہیں۔ وہ اس کے بھی قائل نہیں کہ ادب اپنی بصیرت، مخصوص آگہی اور خود مکتفی حقیقت کے بجائے محض ایک سیاسی یا سماجی دستاویز بن کر رہ جائے، ان کا ایقان ہے کہ بڑا فنکار ایک منضبط اور طے شدہ نظام میں خواہ وہ سیاسی ہو، یا مذہبی ہو، یا اخلاقی ہو اپنے آپ کو پوری طرح محدود نہیں کرسکتا۔

افسانوی ادب کی تنقید پر سرور صاحب کا مضمون 'فکشن کیا، کیوں اور کیسے' کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کہ اس مضمون کے حوالے کے بغیر، یا بغیر اس کے مطالعے کے سرور صاحب کی مکمل فکشن تنقید پر گفتگو ناممکن نہیں تو ناقص، ادھوری یا اکہری بہرطور ہوگی کہ اس مضمون میں سرور صاحب نے فکشن اور فکشن نگاروں سے متعلق اپنی گزشتہ کئی پسند وناپسند میں تبدیلی کا اعلان کیا ہے، بعض خیالات سے رجوع کیا ہے اور تصورات تک توڑے ہیں۔ اس کے علاوہ فکشن تنقید کے قدیم پیمانوں کی جگہ جدید طریقۂ کار کو اپنایا ہے، لفظوں کی شوخی اور اظہار رائے پر دلائل اور حوالوں کو فوقیت دی ہے۔ تنقید میں عمومیت پر تخصیص کو ترجیح دی ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "ایک اچھے ناول کے نقاد کا سب سے بڑا دردِ سر یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ناول کی تخلیق کے فن، تکنیک، اسلوب، تنقیدی اصولوں، ہیئت کی شکست وریخت اور اُس کے دَور تک لکھی گئی تنقید وتحقیق سے واقف ہو بلکہ اسے آگے بڑھانے کا فن بھی جانتا ہو۔"

کہنے کی اجازت دیجیے کہ سرور صاحب نے اپنے علم اور اپنی مخصوص صلاحیتوں کے مطابق فکشن تنقید کو نہ صرف سلیقے اور دیانتداری سے برتا ہے، اس کے تمام پہلوؤں پر غور کیا ہے، اس پر مختلف تحریکات ورجحانات اور تصورات و نظریات کے اثرات کا جائزہ لیا ہے بلکہ اسے آگے بڑھانے میں بھی نمایاں اور مخلصانہ کردار ادا کیا ہے۔ جسے بہرطور فکشن تنقید پر سرور صاحب کے احسان سے تعبیر کیا جانا چاہیے۔ ●●

اصلی جنت کیسی ہوگی

ابوبکر عباد

میرے گھر کی چوحدّی
دنیا کی اک جنت ہے
اونچے اونچے پیڑ یہاں ہیں، پیڑوں پہ چڑیاں آتی ہیں، صبح پہر اور شام ڈھلے سب گاتی ہیں
نظم، غزل اور حمد، بھجن، گربانی، گیت اور جانے کیا کچھ
آکاش کی نیلی چنری تلے
تاروں جیسے پھول کھلے ہیں، اجلے، اودے، کاسنی، پیلے، لال بنفشی
کسی میں رنگت، کسی میں خوشبو، کسی پہ تتلی رقص ہیں کرتی، کسی پہ بھونرے گاتے ہیں
اکثر تب، جب
ساون کی کنّیائیں میگھا جام سے مدرا چھلکا جاتی ہیں اور جسموں کے رنگ سے ان کے قوس قزح بن جاتی ہے
جاڑوں کی صبحوں میں سبزے قسمت پر اتراتے ہیں
یوں کہ گود میں اندر کی پریاں اپنے کنٹھ کی مالاؤں سے جل موتی بھر جاتی ہیں
گرمی کی دوپہری میں یاں سناٹا چلاتا ہے
جیسے دنگے بعد شہر میں گھر گھر غم چھا جاتا ہے
نازواداسی پگڈنڈی محبوب کی بچھڑی یادوں میں امید لہر بن جاتی ہے
آموں کے موسم میں امیا جوبن پر جب آتی ہیں
گھر لوٹی پردیسی کوئل شرماتی چھپ جاتی ہیں
جانے خوشی یا غم سے شاید کوکتی ہیں یا گاتی ہیں
گو، کانوں میں رس گھلتا، پر دل میں ٹیس جگاتی ہیں
اشجار کی عادت پگلی خزاں میں بچوں سی بن جاتی ہے
کپڑے بدلے سے پہلے وہ ننگ دھڑنگ ہو جاتے ہیں
جیسے بچپن میں ہم سارے ندّی میں جانے پہلے
اصلی جون میں آتے تھے پھر کپڑے پہن گھر جاتے تھے
کیا سچی جنت ایسی ہوگی؟
وہاں بھی سارے موسم ہوں گے، موسم کی تخلیق بھی ہوگی؟
غم کے کالے دیو وہاں، امیدوں کی دوشیزہ ہوگی؟
خدشے، خوشیاں، دوست اور دشمن، بچے بوڑھے ہوں گے کیا؟
نہیں؟
تو پھر دنیا ہی اچھی
گھر کی یہ چوحدّی اچھی ●●

16.6.2020

عشق ھی ،عشق ھے

ابوبکرعباد

عشق جسم نہیں، کیف ہے سر شاری ہے
پَرتوِ عرش ہے یہ، روح کی بیداری ہے
یہ محض نور نہیں، نور کی پُرکاری ہے
یوسف وزَنِ مصر نہیں، دیدۂ یعقوب ہے عشق
بے گھری رام کی عشق، دشرتھ کی المنا کی ہے
عشق سیتا کی وفا، عشق مریم کا یقیں
عشق لحنِ داؤد ہے، صبرِ ایوب ہے عشق
عشق جذبۂ سوہنی، حوصلۂ کوہکن
عشق منزل نہیں، جستجو عشق ہے
عشق چندا نہیں، چاندنی عشق ہے
آبرو عشق ہے، کوئی موتی نہیں
قد وصورت نہیں
فکر وفن ہی نہیں
چاہنا عشق ہے
چاہنا بھی کہاں؟
ڈوبنا عشق ہے
یا یہ سب کچھ نہیں
عشق ہی، عشق ہے ●●

18.6.2020

اَلَم تَرَ کیفَ فَعَلَ رَبُّكَ

(کیا تم نے نہیں دیکھا تمھارے رب نے کیسا کیا)

ابوبکرعباد

اور پھر یہ طے کیا خالق کونین نے
اشرف المخلوق کی کہنہ دنیا کے لیے
جس میں اس کے بے زباں کچھ خلق کردہ ذی نَفَس
جو بحر وبر میں ہیں مکیں ان کے تحفظ کے لیے
اس فضائے نیلگوں کی آبرو
بہتے پانی کی نظافت کے لیے
پربتوں کے حسن، زمیں کے نظم کو
دلکشیِ وادی وصحرا بچانے کے لیے
حمد کرتے سبز کپڑوں میں کھڑے
صف بہ صف پیڑوں کی نزہت کے لیے
پھولوں سے دہکے چمن، دل کو لبھاتی تتلیوں
خوش گلو حمد وثنا کرتے طیور
اور صبا کی تازگی کے واسطے
جارہے امراض کے تنّور میں
نسل آدم کی حفاظت کے لیے

اور خود سر داعیِ موت وحیات
قسمتوں کے فیصلوں کے دعوے دار
رب کی دھرتی پر اکڑتے صاحبانِ اقتدار
کِبر کی معراج پر بیٹھے دنی
وارثِ فرعون وراون کو جتانے کے لیے
بے بسی، بے چارگی اُن کی دکھانے کے لیے
مچھروں سے لاکھ درجے کمتر وکمزور جاں
اُس نے بھیجے اِس جہاں میں یہ بتانے کے لیے
”ہاں ! قادر مطلق ہوں میں
غفار بھی قہار بھی
صانعِ ارض وسما،
مسبب الاسباب بھی“ ●●

نزولِ کورونا کے حوالے سے ایک نظم
عہدِ کورونا کے منتھن سے نکلی ایک نظم

16.5.2020

اقبال کا فلسفۂ عقل و عشق

ڈاکٹر سیّد آلِ ظفر

عَقل وعِشق کی کشمکش اوراُس کے مقام کے تعیّن کا مسئلہ دنیا کے حکماء اورشعراء کا بے حداہم اوردلچسپ موضوع رہا ہے۔ ہر دَور میں اُردواورفارسی کے شعراء نے اس تعلق سے حکیمانہ بحثیں کی ہیں لیکن کسی نے بھی عشق کا اتناواضح اور بالیدہ تصوّر نہیں پیش کیا ہے جتنا کہ اقبالؔ نے اس موضوع کو توسّع اور ترفّع بخشا ہے۔ بڑی وضاحت وصراحت کے ساتھ پہلے ان دونوں کا تعارف کرایا ہے۔ پھر ان دونوں کے درمیان رشتے متعین کئے ہیں اور اُن کی خوبیوں اور خامیوں کی وضاحت کی ہے۔ عشق کو اقبالؔ نے اس کا صحیح جامہ پہنایا ہے۔ اس کی وُسعتوں کو سمجھایا ہے اور اُس کی قوتِ تسخیر سے ہمیں آگاہ کیا ہے۔ یعنی عشق کی خارجی اور داخلی خوبیوں کو اتنی خوبصورتی سے انھوں نے اپنے کلام میں جگہ دی ہے کہ ہم اس کی عظمت کے قائل ہوجاتے ہیں اوراُس کی پاکی کو سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

غالبؔ نے بھی عشق کی اہمیت کو شریفانہ اور شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ اُس نے اِس حقیقت کی طرف اِشارہ کیا ہے کہ زندگی کی تمام لذّتیں اور کیفیتیں عشق میں پوشیدہ ہیں ؎

عِشق سے طبیعت نے زیست کا مَزا پایا
دَرد کی دَوا پائی، دَردِ بے دَوا پایا

اور مولانا روم اس طرح کہتے ہیں ؎

دور گردوں باز موج عشق داں
چُوں نبودے عِشق بفِسردے جہاں

اور اقبالؔ یہ کہتے ہیں ؎

وہ پُرانے چاک جن کو عَقل سی سکتی نہیں
عِشق سیتا ہے اُنہیں بے سُوزن و تارِ رَفو!

اقبالؔ کے نزدیک عشق کی بڑی فضیلت ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا شوق کے ہنگاموں سے خالی ہوتی، یہاں کسی قسم کی رَونق نہیں پائی جاتی، اگر اِنسان کا دل عشق کی دولت سے خالی ہوتا۔ انہوں نے عشق کو ہر جگہ عقل پر ترجیح دی ہے۔ لیکن اس کا ہرگز یہ معنی نہیں ہے کہ عقل کو بے کار سمجھا ہے۔ وہ عقل کی خوبیوں کی بھی تعریف کرتے ہیں کیونکہ انسان کے پوشیدہ اَوصاف اسی سے ظاہر ہوتے ہیں۔ خصوصاً اِس مادی اور سائنسی دور میں عقل نے بہت کارنامے انجام دیے ہیں لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود عقل سب کچھ نہیں ہے۔ اس میں خوبیوں کے ساتھ بہت ساری خامیاں بھی ہیں۔ اس کی سب سے بڑی خامی تذبذُب اور کیوں اور کس طرح کے اَندیشے میں گرفتار ہونا ہے۔ اس میں جرأت رِندانہ کی کمی ہے۔ عقل وہی کام کرتی ہے جس میں اِس کو فائدہ نظر آتا ہے۔ نُقصان سے یہ کوسوں دور بھاگتی ہے۔ یہ آرام طلب اور عیش پسند ہے۔ جفا طلبی کی اس میں سخت کمی ہے۔ اِس لیے اقبالؔ عشق کے ساتھ عقل کا ہمیشہ رہنا مناسب نہیں سمجھتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

اچّھا ہے دِل کے ساتھ رَہے پاسبانِ عَقل
لیکن کبھی کبھی اِسے تنہا بھی چھوڑ دے

عقل رہبری تو کرسکتی ہے لیکن دانش مندی کے ساتھ نہیں۔ کیونکہ عقل بے شمار بندھنوں میں بندھی ہوئی ہے۔ یہ ایک مَسئلہ کو حل کرنا چاہتی ہے کہ ہزاروں مسائل میں گرفتار ہوجاتی ہے۔ اکبرالہ آبادی نے عقل کے متعلق کیا خوب کہا ہے ؎

فلسفی کو بحث کے اندر خُدا مِلتا نہیں
ڈور کو سُلجھا رہا ہے اور سِرا مِلتا نہیں

یعنی حقیقت تک پہنچنے کے لیے جس نور کی ضرورت ہے وہ علم یا عقل نہیں ہے، عشق ہے۔ عقل سے دماغ روشن ہوسکتا ہے، دل نہیں۔ اقبالؔ علم و عقل کے متعلق فرماتے ہیں ؎

عَقل گو آستاں سے دُور نہیں
اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دلِ بینا بھی کر خُدا سے طَلب
آنکھ کا نُور، دِل کا نُور نہیں
عِلم میں بھی سَرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حُور نہیں

اِس کے بَرعکس عشق میں جرأت مندی ہے۔ عشق کے ذریعہ ایسے ایسے کارنامے انجام پاتے ہیں جن کے متعلق عقل کبھی سوچ بھی نہیں سکتی ہے۔ علم خبر دینے کا کام کرتا ہے۔ عقل پتہ دیتی ہے اور عشق صاحبِ نظر بناتا ہے۔ حقیقت تک بلا واسطہ پہنچنے کی نظر اور ہمت پیدا کرتا ہے۔ یہ ہمارے دل کی آنکھ کو روشن کرکے تمام حجابات کو ختم کردیتا ہے۔ عشق کی اِسی خوبی نے انسان کو اَشرف بنایا ہے۔ عشق کے کارنامے دیکھ کر عقل عَش عَش کرنے لگتی ہے۔ عقل انسانی زندگی میں کچھ کارنامے ضرور انجام دیتی ہے۔ زندگی پر اس کا بھی احسان ہے۔ لیکن اس کی کوتاہی اور کم نظری بھی اپنی جگہ مُسلّم ہے۔ عقل بغیر عشق کی مدد کے کوئی نمایاں کام نہیں کرسکتی ہے۔ یہاں تک کہ عبادت و ریاضت بھی عشق کے بغیر بے کار ہے۔ عقل اور عشق کے مقام کو اقبالؔ نے اس شعر میں کیا خوب واضح کیا ہے ؎

عقل و دِل و نگاہ کا مرشدِ اوّلیں ہے عشق

Associate Professor,P. G. Dept. of Urdu B. R. A. Bihar University Muzaffarpur
(Bihar)Mob. : 94300 84261

عشق نہ ہوتو شرعِ ودیں بُت کدۂ تصوّرات

اقبالؔ یہاں تک کہہ چکے ہیں کہ عشق مُصطفائیؐ ہے اور عقل بولہبی ہے چنانچہ فرماتے ہیں ؎

تازہ مرے ضَمیر میں معرکۂ کُہن ہوا
عشق تمام مصطفیؐ! عقل تمام بولَہب

اِتنا ہی نہیں اقبالؔ یہ بھی کہنے سے باز نہیں آتے ہیں کہ عشق مومن کے ایمان کے لیے جُزولاینفک ہے۔فرماتے ہیں ؎

اگر ہو عشق ،تو ہے کُفر بھی مُسلمانی
نہ ہو،تو مَردِ مُسلماں بھی کافر و زِندیق

عشق نے ایسے ایسے کارنامے انجام دیے ہیں کہ عقل ہمیشہ حیرت سے دیکھتی رہ گئی ہے۔حضرت ابراہیمؑ کے جذبہ میں عشق ہی تھا اور حضرت امام عالی مقام کی شہادت میں بھی عشق ہی کی گرمی تھی۔اقبالؔ اِس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حُنین بھی ہے عشق

اقبالؔ کا عقیدہ ہے کہ دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح عقل بھی ہمارے لیے ایک خادم کا درجہ رکھتی ہے۔دنیا والے گرچہ عقل کی رَہبری سے کام لینا بہتر سمجھتے ہیں لیکن انھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ عشق عقل سے زیادہ بہتر ہے ؎

زَمانہ عَقل کو سمجھا ہوا ہے مَشعلِ راہ
کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ اِدراک

گویا علامہ نے عقل کی ضرورت محسوس کی ہے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ دِل کے ساتھ عقل کا رہنا بہتر ہے۔لیکن ہمیشہ نہیں کیونکہ عقل انجام کو دیکھتی ہے۔یہ ہر کام کے کرنے سے پہلے بار بار سوچتی ہے اور عشق اس کے برعکس انجام کو نہیں سوچتا ہے یہی وجہ ہے کہ علامہ یہ کہتے ہیں ؎

عِشق کی اِک جَست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

علامہ کے یہاں عشق لافانی ہے۔یہ ہمہ گیر اور آفاقی ہے۔جس فن میں عشق کی گرمی شامل ہو جاتی ہے وہ فن لافانی ہو جاتا ہے۔عشق خود ایک طوفان اور سیلاب ہے جو دوسرے طوفان اور سیلاب کو روک لیتا ہے۔اِس کا مقام بہت بُلند ہے۔چنانچہ یہ کہتے ہیں ؎

مردِ خُدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عِشق ہے اصلِ حیات،موت ہے اُس پر حَرام
تُند و سُبک سیر ہے گرچہ زمانے کی رَو
عِشق خود اِک سیل ہے سیل ہے،کو لیتا ہے تھام

عِشق دمِ جبرئیلؑ،عشق دلِ مصطفےٰؐ
عِشق خُدا کا رسولؐ،عشق خُدا کا کلام

عِشق کی مَستی سے ہے پیکرِ گُل تابناک
عِشق ہے صہبائے خام، عِشق ہے کاسُ الکرام
عِشق فقیہِ حَرم، عِشق امیرِ جنود
عِشق ہے اِبن السبیل، اِس کے ہزاروں مقام

عِشق ہی سب کچھ ہے اسی سے زندگی میں رنگت اور تب و تاب ہے۔یہ زندگی کا نغمہ ہے اور اسی سے زندگی میں چمک دمک ہے۔چنانچہ علامہ کہتے ہیں ؎

عِشق کے مِضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عِشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

مختصر یہ کہ اقبالؔ نے عقل و عِشق کی بحث جہاں بھی چھیڑی ہے عِشق کو بُلند و بالا دکھایا ہے۔اور عقل کو اُس کی راہ میں رکاوٹ ثابت کیا ہے۔عقل میں سوچنے سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی صلاحیت ضرور ہے لیکن اِس میں حد درجہ نُکتہ چینی اور مَصلحت کوشی ہے۔اور یہ مَصلحت کوشی عِشق کے لیے رُکاوٹ ہے۔عِشق بغیر اَنجام کو سوچے سمجھے بے خطر کودنا جانتا ہے اور عقل سوچ میں پڑی دور ہی سے تماشا دیکھنا چاہتی ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نَمرود میں عِشق
عَقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عَقل عیّار ہے سَو بھیس بَنا لیتی ہے
عِشق بے چارہ نہ مُلّا ہے، نہ زاہد، نہ حکیم ●●

تصوف، تزکیہ اور کبیر

ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی

تصوف ایک ایسا وسیع موضوع ہے، جس پر ہر زمانے میں علما کے مابین بحث رہی ہے۔ ایک جماعت اسے غیر اسلامی تصور کرتی ہے تو دوسری اس کا تعلق مذہب اسلام سے جوڑتی ہے۔ علماً کی اس بحث سے قطع نظر اردو ادب میں اس کی حقیقت و ماہیت اور ادب میں اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ہی تصوف پر مختلف النوع بحثیں رہی ہیں۔ وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے ساتھ ساتھ 'قادریہ'، 'چشتیہ'، 'نقشبندیہ' اور 'سہروردیہ' سلسلے بھی اپنی جگہ قائم ہیں۔ صوفیوں کا مسلک خواہ کچھ بھی رہا ہو لیکن یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ انہوں نے اپنے اوصاف سے ہندستان میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ مثال کے لیے خواجہ معین الدین چشتیؒ کا اجمیر سے ڈھاکہ تک کا سفر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ درج بالا موضوع پر تفصیلی گفتگو کی جائے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے لغوی معنیٰ پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے:

''تصوف کے لغوی معنیٰ: خواہشِ نفسانی سے پاک ہونا، وہ علم جس کے وسیلے سے صفائی قلب حاصل ہو۔ اشیأ عالم کو مظاہرِ صفات حق جاننا۔ تزکیۂ نفس کا طریقہ، قطع عنِ الغیر یعنی سوائے واجب الوجود کے سب اشیأ کو موہوم اور لاموجود سمجھ کر مشغولی کے لائق نہ جاننا، مذہبِ صوفیہ۔ اگر اس کا مادہ بضمّ صادِ مہملہ صوف قرار دیں گے تو پشمینہ پوشی اور گردن تک کا کلیں چھوڑنا اِس کی اصل ٹھہرے گی یعنی فقرا کا وہ فرقہ جو اول میں پشمینہ پہنا کرتا یا کاکلیں چھوڑا کرتا تھا اور جو صَوف بفتحِ صاد ٹھہرائیں گے یکسو وردو گردان ہونے سے مراد ہوگی چوں کہ واصلانِ حق اسوی اللہ سے یکسو اور روگرداں ہوتے ہیں لہٰذا انکو صوفی اور انکے فعل کو تصوف کہتے ہیں۔''

فرہنگِ آصفیہ، جلد اول، ص: ۱۷۷، ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۰

اس کا مطلب یہ ہے کہ تصوف میں قلب کی صفائی، خواہشِ نفسانی سے پاکی اور تزکیۂ نفس پر خاص زور دیا جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ قلب کی یہ پاکیزگی حاصل کرنے کے لیے اہل سالک ''تزکیہ''، ''تجلّی'' اور ''وصل'' کی منزلیں طے کرتے ہوئے ''وجد'' تک کا سفر کرتے ہیں۔ درج بالا سطور میں ہم نے تصوف کی جو تعریف پیش کی ہے وہ لغت کے اصولوں کے تحت ہے لیکن اس تعریف کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ صوفیا کرام نے اس کے کیا معنیٰ اخذ کیے ہیں؟

''تصوف اسلام کی ایک ایسی شاخ ہے کہ جس میں روحانی نشو نما پر توجہ دی جاتی ہے۔ تصوف کی متعدد جہتوں میں اللہ کی ذات کا شعور حاصل کرنا، روحانی کیفیات اور ذکر (رسماً و جسماً) اور شریعت بیان کرتے ہیں۔''

اسی طرح مولانا سعید احمد اکبر آبادی تصوف کی تعریف اپنے ایک مضمون 'اقبال اور تصوف' میں کچھ اس طرح کرتے ہیں:

''تصوف کی تعریف اور اصل حقیقت ہے تزکیۂ نفس اور تجلیۂ باطن کر کے ایسا پاک وصاف اور روحانی کمالات اور اخلاقی اعتبار سے ایسا بن جانا کہ دل عشق الٰہی کا گہوارہ ہو۔ اور اس کی وجہ سے وہ سراپا سوز و گداز اور ہمہ تن جذب و شوق ہو۔''

بہ حوالہ: مسائل تصوف اور اقبال، ڈاکٹر بشیر احمد نحوی، ادارہ علم و ادب، بیج بہاڑہ، کشمیر، ص: ٦

تصوف کو ہم صرف ایک نظریہ ہی نہیں بلکہ ایک طرز عمل یا طرزِ زندگی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس عمل میں کئی ایک منزلیں جیسے تزکیہ، تجلی، وصل اور وجد ایک کے بعد ایک آتی ہیں، جس پر عمل پیرا ہونے کے بعد ایک صوفی اپنی ریاضت سے سالک کی منزل کی طرف آگے بڑھتا جاتا ہے، جس کا آخری زینہ یا آخری منزل وجد کہلاتی ہے، جہاں تک رسائی خاصا مشکل کام ہے۔

کبیر داس (۱۳۹۸۔۱۵۱۸/۱۴۴۸) ہندستانی ادب کا ایک ایسا نام ہے، جس کا ہندستانی تصوف کی تاریخ میں بڑا مقام ہے۔ ان کا تعلق اس عہد سے ہے جب کہ اردو اور ہندی کی تخصیص قائم نہیں ہوئی تھی۔ ان کی زبان پوربی اور اردھ ماگدھی کی ملی جلی زبان ہے جو آج بھی بنارس اور اس کے آس پاس کے علاقوں کی بول چال کی زبان ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں بار بار تزکیۂ نفس یا دل کو صاف رکھنے پر بہت زور دیا ہے۔ مثلاً:

کبیرا کھڑا ابجار میں لیے لکاٹھی ہاتھ جو گھر پھونکے آپنو، چلے ہمارے ساتھ
میں میرا گھر جالیا، لیا پلیتا ہاتھ
جو گھر جارو آپنا، چلو ہمارے ساتھ

مذکورہ دوہوں میں کبیر نے اپنے گھر کو پھونکنے اور جلانے کی بات کہی ہے لیکن یہ گھر کونسا ہے؟ یہ غور کرنے کی بات ہے۔ کیا جس گھر میں ہم رہتے ہیں، اس کو جلانے کی بات ہو رہی ہے یا کوئی دوسرا گھر ہے؟ یقیناً وہ اس گھر کو پھونکنے کی بات نہیں کر رہے ہیں، جس میں انسان رہتا ہے۔ اگر اس گھر کو پھونکنے کی بات کرتے، جس میں انسان رہتا ہے تو پاگل کہے جاتے لہٰذا انھوں نے اس گھر کو پھونکنے کی بات کی جو ہم نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں بنا رکھے ہیں یعنی: حرص، انا، ہوس، تکبر، موہ مایا، نفرت، آرزوئیں، اونچ نیچ وغیرہ۔ یہ وہ گھر ہیں، جن کی وجہ سے انسان طرح طرح کے مسائل سے عمر بھر دوچار رہتا ہے۔ کبیر کا کہنا یہ ہے کہ میں نے اپنے دل کے تمام نہاں خانوں کو پھونک دیا ہے، جس میں طرح طرح کی آرزوئیں، بغض، کینہ اور کدورتیں تھیں اور وہ لوگ جو میری ہی طرح اپنے دلوں کے اندر بنے ایسے گھروں کو پھونک سکتے ہیں یعنی اپنی خواہشیں، آرزوئیں مٹا سکتے ہیں یا اپنے دلوں کو دنیا کی کدورتوں سے پاک کر سکتے ہیں، وہ میرے ساتھ بلا جھجک آ جائیں۔

ان کا یہ پیغام تزکیۂ نفس کی طرف بلاوا ہے کہ جو لوگ اپنے دلوں کو موہ مایا سے پاک کر لیں وہ ان کے سلوک کی منزل میں شامل ہو سکتے ہیں کیوں کہ جب

تک دلوں کو کدورتوں سے پاک نہیں کیا جائے گا، انسان کو سکونِ قلب حاصل نہیں ہو سکتا جو کہ تصوف کے پہلے زینے یعنی تزکیۂ نفس کا تقاضا ہے کہ دلوں کو کدورتوں سے پاک رکھا جائے لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں اور آج کے دور میں تو بالکل ہی نہیں کیوں کہ آج کے آپا دھاپی اور انانیت سے بھرے ہوئے سماج میں اس کا حصول خاصا مشکل کام ہے لیکن ایسے ہی سماج میں اس کی سب سے زیادہ ضرورت بھی ہے تا کہ لوگوں کو سکون نصیب ہو سکے۔

کبیر کے نزدیک ہر کوئی صوفی نہیں بن سکتا کیوں کہ تزکیۂ نفس کے لیے بہت کٹھن محنت، عبادت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کے لیے دنیاوی مایا جال، موہ مایا، لالچ اور غصے پر قابو، ذات پات اور اونچ نیچ اور امیر غریب جیسے معاملات کو ترک کرنا آسان نہیں۔ شاید اسی لیے وہ کہتے ہیں:

کامی کرودھی لالچی، اِن سے بھکتی نہ ہوئے
بھکتی کرے کوئی سورما، جاتی بَرَن کُل کھوئے

☆☆☆

مایا چھوڑن سب کہیں، مایا چھوڑی نہ جائے
چھوڑن کی جو بات کرے، بہت طمانچہ کھائے

☆☆☆

جھینی مایا جِن تجی، موٹی گئی بِلائے
ایسے جَن کے نکٹ سے، سب دکھ گئے ہِرائے

ہماری شاعری میں دلی کیفیات کا ذکر ان گنت طریقے سے کیا گیا ہے لیکن خواہشِ نفسانی کو ترک کرنے کی تلقین بار بار جس طرح سے کبیر نے کی ہے، اس سے ان کے دل کی کیفیات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انہیں قناعت پسندی سے کس قدر پسند تھی۔ مذکورہ دوہوں میں بھی خواہش نفسانی کو ترک کرنے کی بات کہی گئی ہے۔ پہلے دوہے میں کہتے ہیں کہ کامی یعنی خواہش نفسانی رکھنے والے، غصے والے اور لالچی کے بس کی بات نہیں ہے کہ وہ تصوف کی راہ پر چل سکیں۔ اس راہ پر تو وہ سورما یا بہادر ہی چل سکتا ہے جو ذات پات، نسل، خاندان اور اونچ نیچ کے امتیاز سے بالاتر ہو۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ جس نے چھوٹی چھوٹی خواہشیں ترک کر دیں، اس کے دل سے بڑی خواہشیں اپنے آپ نکل جاتی ہیں۔ اسی تزکیۂ نفس کے سلسلے میں ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ:

جب لگ ناتا جاتی کا، تب لگ بھکتی نہ ہوئے
ناتا توڑے گرو بھجے، بھکت کہاوے سوئے

ہم نے مثال کے طور پر اب تک جتنے دوہے تزکیۂ نفس کے سلسلے میں درج بالا سطور میں پیش کیے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کبیر کے نزدیک کوئی شخص تب تک سالک کی راہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک کہ وہ دنیاوی رشتوں کو ترک نہیں کر دیتا۔ دنیاوی رشتوں کو ترک کر کے جو خدا کی عبادت میں غرق ہوگا، وہ ہی صوفی کہلانے کا مستحق ہوگا۔ کیوں کہ صوفی کی راہ صبر و قناعت کی راہ ہوتی ہے۔ وہ خالقِ کائنات سے صرف اتنا ہی چاہتا ہے کہ:

سائیں اتنا دیجیے، جا میں کٹمب سمائے
میں بھی بھوکا نہ رہوں، سادھو نہ بھوکا جائے

مذکورہ دوہے سے ایک صوفی کی دعا بالکل واضح ہے کہ وہ صرف اپنی ضرورت بھر ہی چاہتا ہے نہ کہ اپنے آپ کو اعلیٰ ہونے کی بات کرتا ہے۔ آج مادیت پرستی کے اس دور میں اس طرح کی دعا مانگنا، اپنے آپ میں ایک بکٹ بات ہو سکتی ہے لیکن ایک صوفی کے لیے یہ آج بھی ممکن ہے کیوں کہ وہ دنیاوی خواہشوں کو ترک کرنے کے بعد ہی سالک کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس دور میں سوائے صوفی کے شاید ہی کوئی ایسی دعا مانگ سکے کیوں کہ انسانی خواہشیں وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی اور تبدیل بھی ہوتی رہتی ہیں۔ اس لیے آرزوؤں پر قابو پانا ایک جہد مسلسل سے کم نہیں ۔ کیوں کہ:

مایا مَری نہ من مَرا، مَر مَر گئے شریر
آشا ترشنا نہ مَری، کہہ گئے داس کبیر

دنیاوی خواہشیں کبھی ختم نہیں ہوتیں۔ انسان ہمیشہ کوئی نہ کوئی خواب بنتا ہی رہتا ہے اور اس کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے سرگرداں بھی رہتا ہے۔ رشتوں کو سمجھنے، انہیں نبھانے، مزاج کو معتدل بنانے کے لیے کبیر نے نہایت خوب صورت مشورہ دیا ہے۔ کہتے ہیں:

نِندک نیرے راکھیے، آنگن کٹی چھوائے
بن پانی، صابن بنا، نِرمل کرے سبھائے

یعنی نکتہ چیں یا ناقد کو اپنے گھر کے آنگن میں کٹیا بنوا کے اپنے آس پاس ہی رکھیے تا کہ وہ آپ کے مزاج کو بنا پانی اور بنا صابن کے نرمل بنا دے یعنی بالکل صاف و شفاف۔ نِندک کو اتنا بڑا مرتبہ شاید ہی کبھی کسی نے دیا ہو، جیسا کہ کبیر نے دیا ہے۔ شاید آج کے دور میں ایسا ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی اپنی کمیوں، خامیوں اور کوتاہیوں کو اجاگر کرنے والے کو اپنے آس پاس پھٹکنے دے۔ نندک (عیب جو/نکتہ چیں) کو نزدیک رکھنا تو بڑی دور کی بات ہے۔ کیوں کہ آج کا دور تو کچھ ایسا ہے کہ:

کرئے برائی سکھ چہے، کیسے پاوے کوئے
روپے پیڑ ببول کا، آم کہاں سے ہوئے

☆☆☆

بڑا ہوا تو کیا ہوا، جیسے پیڑ کھجور
پنچھی کو چھایا نہیں، پھل لاگے اتی دور
برا جو دیکھن میں چلا برا نہ ملیا کوئی
جو من کھوجا آپنا مجھ سے برا نہ کوئی

آج کا دور تو ''کرئے برائی سکھ چہے'' کا عادی نظر آتا ہے۔ ساتھ ہی آج کا انسان جیسے ہی اپنی دال روٹی سے ذرا سا خوش حال ہوتا ہے تو وہ اپنے عزیز و اقارب سے دوری اختیار کرنے لگتا ہے۔ کبیر کا ایسے لوگوں کے بارے میں کہنا ہے کہ: ''بڑا ہوا تو کیا ہوا، جیسے پیڑ کھجور'' یعنی ان کے بڑے یا دولت مند ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے جیسے کہ کھجور کے پیڑ کے بڑے ہونے کا کوئی حاصل نہیں ہے۔ ان دوہوں میں جو باتیں کہی گئی ہیں، ان سب کا تعلق کہیں نہ کہیں تزکیۂ نفس سے ہے۔ آدمی خواہ کتنا ہی بڑا ہو جائے اس کو بنیادی انسانی قدروں کا پاس رکھنا چاہیے۔ کھجور کے پیڑ کی طرح کا بڑا آدمی بننے سے کوئی فائدہ نہیں ہے، کیوں کہ اس کے سائے میں نہ تو پرندے پناہ لیتے ہیں اور نہ ہی اس کا پھل انسان کے ہاتھ آتا ہے۔ اس دوہے میں کہیں نہ کہیں اعلیٰ عہدے/دولت مند ہونے کے بعد فرد واحد کے اندر پیدا ہونے والے تکبر کی طرف اشارہ نظر آتا ہے جو اپنے عہدے کے تکبر سے اپنے آپ کو سماج سے دور کر لیتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے ہی شاید انھوں نے کہا ہے کہ:

اتی کا بھلا نہ بولنا، اتی کی بھلی نہ چوپ

اتی کا بھلا نہ برسنا، اتی کی بھلی نہ دھوپ

ایک طرف جہاں کبیر نے متفرق قسم کے تکبر سے بچنے کی ہدایت دی ہے وہیں دوسری طرف لوگوں کو صبر وقناعت کی بھی تلقین کی ہے۔ کہتے ہیں:

روکھا سوکھا کھائے کے، ٹھنڈا پانی پیو
دیکھ پرائی چوپڑی، مت للچاوے جیو

دل کی کدورتوں کو دور کرنے پر کبیر بہت زور دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید انہیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ تمام خواہشوں کی جڑ ہمارا دل ہے اور خواہشیں پریشانیوں کا اہم سبب لہٰذا جب تک اسے چھل کپٹ اور موہ مایا سے الگ نہیں کیا جائے گا تب تک اصلی عبادت نہیں ہو سکے گی اور جب تک دل میں دنیا آباد ہے تب تک تو دل میں سائیں (خدا) کو جگہ نہیں مل سکتی۔ وہ کہتے ہیں:

جیسے تل میں تیل ہے، جیوں چکمک میں آگ
تیرا سائیں تجھ میں ہے، جاگ سکے تو جاگ

تصوف، تزکیہ اور کبیر کے موضوع پر ہم نے اب تک جتنی باتیں کیں اور مثالیں پیش کیں، ان سے یہ نتیجہ بآسانی سے نکالا جا سکتا ہے کہ کبیر ریاضت کی منزل کا پہلا پڑاؤ دل کی صفائی اور پاکیزگی کو سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ بغیر دل کی صفائی کے کوئی بھی شخص سچی عبادت نہیں کر سکتا لہٰذا سب سے پہلا قدم سالک کی راہ میں دل کو کدورتوں سے پاک کرنا اور دنیاوی موہ مایا سے آزاد کرنا ہے۔ اس کے بعد ہی کوئی انسان سکون حاصل کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں دل کو صاف رکھنے، قناعت پسندی اختیار کرنے اور حرص سے دور رہنے کی تلقین پائی جاتی ہے۔ موجودہ عہد میں کبیر کی باتیں خاصی اہمیت کی حامل ہو گئی ہیں، اس لیے ہمیں ان کے تصورات وخیالات کو پھیلانے اور عام کرنے کی ضرورت ہے۔ آخر میں اپنی بات کبیر ہی کے ایک دوہے پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو عصرِ حاضر میں خاصی اہمیت کا حامل ہے:

کبیر کلجگ کٹھن ہے، سادھو نہ مانئے کوئے
کامی، کرودھی مسکھرا، تنکا آدر ہوئے

کتابیات

۱۔ بیجک، کبیر داس، کبیر پارکھ سنستھان، پریتم نگر، الہٰ آباد۔۲۰۰۲
۲۔ کبیر ساکھی، کبیر داس، کبیر پارکھ سنستھان، پریتم نگر، الہٰ آباد۔۲۰۰۳
۳۔ فرہنگِ آصفیہ، مولانا سید احمد دہلوی، ترقی اردو بیورو، ۱۹۹۰
۴۔ مسائلِ تصوف اور اقبال، ڈاکٹر بشیر احمد نحوی، ادارۂ علم وادب، بیج بہاڑہ، کشمیر

ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی
اسسٹنٹ پروفیسر و کوآرڈینیٹر، شعبۂ اردو، مرکزی جامعۂ کشمیر، پوہرو چوک، نوگام، سری نگر، جموں و کشمیر۔۱۹۰۰۱۵

●●

غزل

مبین مرزا

چلے جائیں گے سب اسبابِ حیرانی نہ جائے گی
کسی صورت دل و جاں کی یہ ارزانی نہ جائے گی

سو اب طے ہے نہ جائیں گی یہ دل کی وحشتیں جب تک
رگوں میں اِس اُمڈتے خوں کی طغیانی نہ جائے گی

سبب یہ ہے کہ پہلے ہو چکا ہے فیصلہ سو اب
گواہی دی تو جائے گی مگر مانی نہ جائے گی

تجھے اُس در سے لینا تھا نیا رنج و الم ہر پل
دلِ وحشت اثر تیری تن آسانی نہ جائے گی

کھلا یہ خون کی وحشت ہے سو میں مر تو سکتا ہوں
مرے اندر سے لیکن خوئے سلطانی نہ جائے گی

میسر آئیں گی ہر پل بہت آسائشیں لیکن
مجھے معلوم ہے اب دل کی ویرانی نہ جائے گی

●●

ایڈیٹر، رسالہ مکالمہ

غزلیں

مبین مرزا

عشق آباد رہے عشق میں وحشت کیسی
دل اگر دکھ بھی گیا ہے تو شکایت کیسی

ہجر میں خود کو سنبھالا ہے امانت کی طرح
اور سوچا کہ امانت میں خیانت کیسی

کیسے بتلائیں کہ وہ دل کی تمنا کیا تھی
کیسے سمجھائیں میسر ہوئی شہرت کیسی

کچھ نہ سمجھے کوئی — لیکن تجھے معلوم رہے
زندگی ہم نے اٹھائی تری تہمت کیسی

تھم گیا درد تو درماں کی طلب بے معنی
آ گیا صبر تو پھر تیری ضرورت کیسی

جسم باقی ہے مگر روح فنا ہو بھی چکی
سر سے اِس بار یہ گزری ہے قیامت کیسی

اب یہاں اتنی فراغت ہے کسے ، غور کرے
وقت نے بدلی یہ حالات کی صورت کیسی

کس لیے عذر تراشوں کہ یہ بات ایسے ہوئی
دل سے جو کام کیا اُس پہ ندامت کیسی

لپٹی رہے گی اس طرح قدموں سے دنیا کب تلک
برپا رہے گا خاکِ جاں تیرا تماشا کب تلک

وہ تازہ دم تھا منزلیں آگے بلاتی تھیں اُسے
رکھتا بھی ساتھ اُس کے ہمیں آخر کو رستہ کب تلک

آشفتگی میری ہی کیا اُس کی بھی آنکھیں بول اٹھیں
ہوتا نہ دنیا پر بھلا یہ راز افشا کب تلک

اس کا خیال اپنی جگہ میرا ملال اپنی جگہ
اب دیکھنا ہے اس طرح چلتا ہے قصہ کب تلک

شورِ تلاطم کہہ اُٹھا اب روکنا ممکن نہیں
تھامے رہوں دل میں یونہی آخر یہ دریا کب تلک

مدت ہوئی ڈھوتے ہوئے اس جسم و جاں کے ڈھیر کو
اے زندگی پھرتا رہوں لے کر یہ ملبہ کب تلک

واٹس ایپ

مبین مرزا

آپ کیسے ہیں سرکارِ والا!

کیا ہم آپ کو کبھی یاد آتے ہیں؟

واٹس ایپ پر آنے والے دوسطروں کے اِس میسیج نے شیخ مجیب عالم کو مخمصے میں ڈال دیا۔ دیکھا جائے تو ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی، لیکن سوچا جائے تو کچھ خاص ضرور تھا۔ ان کی چھٹی حس نے پھڑک کر اصل میں ساری مشکل پیدا کی تھی۔ وہ تو روزمرہ کے معمول کے مطابق سب کچھ کر رہے تھے جیسا کہ اب کئی برس سے اُن کی عادت بن گئی تھی، کچھ ایسے ہی انداز سے جیسے ایک مشین یا کوئی روبوٹ سب کچھ دی گئی کمانڈ کے مطابق آٹومیٹک طریقے سے کیے چلا جاتا ہے۔ کسی رُکاوٹ اور ہچکچاہٹ کے بغیر۔ روزمرہ کی یکسانیت پر انھوں نے کئی بار اپنے اندر کسی کو کلبلاتے ہوئے محسوس کیا تھا جو دھیرے سے ان سے کہتا تھا:

زندگی جیسے ٹھہر سی گئی ہے۔

شیخ مجیب عالم نے آج بھی اندر کی یہ آواز سنی، ایک لمحے کے لیے سوچا اور کوفت محسوس کی۔ واقعی دن رات ایک ڈھرے پر آ گئے تھے۔ مخصوص وقت پر صبح ہوتی اور طے شدہ کاموں میں دن گزرتا۔ ایک خاص وقت پر شام ہو جاتی اور اس کے بعد اسی طرح رات۔ دن میں دفتر کے معمولات بھی ایک ہی انداز سے چلتے رہتے۔ رات کو گھر آ کر تھوڑا وقت بچوں اور بیوی کے ساتھ، کچھ دیر ٹی وی کے سامنے اور بس دن رات کا دائرہ پورا ہو جاتا۔ بچے اب بڑے ہو گئے تھے۔ ان کی اپنی مصروفیات تھیں اور زندگی گزارنے کا ایک انداز بن گیا تھا۔ بیوی نے خود کو گھر کے کاموں، ٹی وی اور نماز روزے میں مصروف کر لیا تھا۔ شیخ مجیب عالم کا ایک چھوٹا سا سوشل سرکل بھی تھا جس کے لوگ آپس میں فون اور میل کے ذریعے رابطے میں تو رہتے مگر ملنے ملانے کا موقع کم کم ہی نکلتا۔ دفتر کے ملازم نے ان کے لیے چائے لا کر رکھی تو شیخ مجیب عالم نے اخبار کو ایک طرف کیا اور لیپ ٹاپ کو سرکاتے ہوئے سامنے کر لیا۔ ایسا کرتے ہوئے کی بورڈ پر کہیں ہاتھ لگنے سے لیپ ٹاپ کی اسکرین روشن ہو چکی تھی۔ انھوں نے میل چیک کرنے کے لیے گوگل کروم پر کلک کیا اور چائے کا کپ اٹھا لیا۔

یکسانیت کا احساس پچھلے کئی دن سے مسلسل بور کر رہا تھا، لیکن اس سے نکلنے کا کوئی راستہ انھیں سوجھ نہیں رہا تھا۔ اصل میں سب سے بڑا مسئلہ تو آدمی کی زندگی میں وقت پیدا کرتا ہے، وہ اکثر سوچتے۔ بس اس کے ساتھ ہی سوالوں اور خیالوں کا سلسلہ چل نکلتا، مثلاً یہ کہ وقت ہے کیا؟ ایک بہت ایب سرڈ چیز۔ اسے چھوا جا سکتا ہے نہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے گھومتے ہوئے پہیے کو روکا نہیں جا سکتا، الٹا نہیں پھیرا جا سکتا، اس کی رفتار کو گھٹایا تک نہیں جا سکتا۔ وقت کے ساتھ کچھ نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ آپ کے ساتھ سب کچھ کرتا ہے۔ آپ کے اندر ہوا بھر دیتا ہے اور آپ بادلوں پر سفر کرنے لگتے ہیں۔ یہ آپ کو بلندی پر لے جاتا ہے اور پھر یہ دُنیا، یہ زمین، اس کی سب چیزیں آپ کو چھوٹی نظر آنے لگتی ہیں۔ آپ ہوا میں تیرتے رہتے ہیں۔ کششِ ثقل آپ کا کچھ نہیں بگاڑ پاتی، اپنے سارے زور کے باوجود آپ کو نیچے نہیں لا پاتی۔ قوسِ قزح کے رنگ کبھی آپ پر برستے ہیں اور کبھی آپ کے اندر سے پھوٹتے اور آسمان پر پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ زمین آسمان دونوں پر آپ کا تصرف قائم ہوتا ہے۔ آپ کی پسند، آپ کا اختیار ہر جگہ نظر آتا ہے۔ کسی اور کی زندگی میں ایسا ہو یا نہ ہو، کم سے کم شیخ مجیب عالم کی زندگی میں تو ایسا ہی ہوا تھا۔

یہ تو گئے دنوں کی بات ہے۔ انھوں نے اپنا پاس ورڈ ٹائپ کرتے ہوئے سوچا۔ اب تو وقت اُن کے ساتھ بھی وہی چال چل چکا تھا جو سب کے ساتھ چلتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے سامنے کوئی بادشاہ ہے یا فقیر اور نیک ہے یا بد۔ وہ اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ شیخ مجیب عالم کے ساتھ بھی کر چکا تھا۔ اس نے اُن کے اندر جو ہوا بھری تھی، وہ خود ہی دھیرے دھیرے نکال دی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ نیچے آتے چلے گئے اور اب پورے زمین پر تھے۔ وہ سب کچھ جو پہلے بہت چھوٹا اور ناقابلِ توجہ نظر آتا تھا، اب اپنے اصل حجم میں ان کے سامنے تھا۔ وہ پڑھے لکھے اور سمجھ دار آدمی تھے۔ بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ سامنے آنے والے حقائق کو تسلیم کرتے چلے گئے۔ کچھ باتوں کو ماننے میں تکلیف تو ضرور محسوس ہوئی، لیکن وہ جانتے تھے کہ مانے بغیر چارہ نہیں۔ اس لیے انھوں نے ماننے والی ہر بات کو بہر حال مان لیا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ زندگی کے دھکوں سے بچ گئے۔ بس اب یہ تھا کہ کبھی کبھی بوریت اور یکسانیت کا احساس ستانے لگتا۔

اپنے اِن بوکس پر نظر دوڑاتے ہوئے شیخ مجیب عالم نے طے کیا کہ کون سی میل پہلے دیکھنی ہے اور پھر ایک ایک کر کے دیکھتے اور رپلائی کرتے چلے گئے۔ ایک میل ذرا تفصیلی جواب مانگتی تھی، اس لیے انھوں نے اسے آخر میں رکھا تھا۔ جواب دینے کے علاوہ کچھ اٹیچ منٹس بھی اس کے ساتھ بھیجنی تھیں۔ شیخ مجیب عالم نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر کپ کو ایک طرف کیا اور دوبارہ نظریں لیپ ٹاپ کی اسکرین پر جما دیں۔ عین اسی لمحے ہلکی سی بیپ کے ساتھ ان کے موبائل فون کی اسکرین پر میسیج والی روشنی پل بھر کو ابھری اور پھر غائب ہو گئی۔ ان کا ہاتھ بے اختیار موبائل کی طرف بڑھا۔ انھوں نے اسکرین پر اپنا پیٹرن بنا کر موبائل کو اَن لاک کر کے میسیج دیکھا۔ وہی ٹیکسٹ دوبارہ واٹس ایپ پر آیا تھا۔

جس نمبر سے میسیج کیا گیا تھا وہ شیخ مجیب عالم کے فون میں نام سے محفوظ نہیں تھا۔ انھوں نے کئی بار نمبر پڑھا۔ محسوس ہوتا تھا کہ نمبر کچھ مانوس ہے مگر کوئی نام ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ انھوں نے ایک بار پھر میسیج دیکھا۔ یہ انداز کسی ایسے شخص کا معلوم ہوتا ہے جس سے کوئی تعلق رہا ہو، بلکہ ذرا بے تکلفی کا رشتہ۔ انھوں نے سوچا۔ مسئلہ یہ تھا کہ ان کی زندگی میں تو درجنوں ایسے رشتے آئے اور اپنا اپنا وقت پورا کر کے رخصت ہو گئے۔ چھپن برس کی عمر تک آتے آتے جیون رستے میں کتنے ہی موڑ آئے تھے جہاں وہ رُکے تھے، جہاں کسی رنگ نے ان کا دامن تھاما تھا یا کسی آواز نے انھیں

اپنے آنچل میں سمیٹ لیا تھا۔ کہیں کوئی خوش بو اچانک راہ میں آئی تھی اور پھر پل کی پل میں ٹوٹ کر ان پر برسی تھی۔ آدمی کے ساتھ زندگی میں کیا کیا ہوتا ہے، یہ سوچتے ہوئے بہ یک وقت کئی چہرے ان کے ذہن کی اسکرین پر چمک اٹھے۔ دل میں ابھرتی ہوئی کئی آوازیں کانوں میں رس گھولنے لگیں۔ رنگوں کی برکھا برساتے ہوئے کئی لمحات اور کئی مناظر آن کی آن میں آنکھوں کے آگے سے گزر گئے۔ شیخ مجیب عالم کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھے، لیکن پل بھر میں ہنس کر سیدھے ہوئے اور بلند آواز میں خود سے کہا، اچھی ہی گزر گئی زندگی۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ موبائل اب تک ان کے ہاتھ میں تھا۔ آخر یہ کون ہوسکتا ہے؟ انھوں نے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو سر میں پھیرتے ہوئے خود سے دریافت کیا پھر سر کو نفی میں جنبش دیتے ہوئے بولے، پہلے ذرا یہ ہاتھ کا کام نمٹا دیا جائے پھر دیکھتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ لیپ ٹاپ کی اسکرین پر متوجہ ہو گئے۔

کام سے فرصت پا کر انھوں نے موبائل اٹھایا۔ ایک بار پھر میسیج پڑھا، فون نمبر پر غور کیا، لیکن دماغ بس یہ کہہ رہا تھا کہ نمبر کچھ جانا پہچانا ہے۔ اس سے آگے خاموشی تھی۔ انھوں نے ایک مدت سے کوئی ٹیلی فون انڈیکس نہیں بنائی تھی، البتہ ٹیبل ڈائری پر کچھ فون نمبرز کو کبھی کبھی نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ ویسے ضرورت کے سب نمبرز تو اب موبائل میں ہی محفوظ تھے۔ خیال تو نہیں تھا کہ یہ نمبر ٹیبل ڈائری پر کہیں نوٹ کیا گیا ہوگا، لیکن پھر بھی انھوں نے ایک ایک صفحہ پلٹ کر دیکھا۔ نمبر کہیں درج نہیں تھا۔ ذہن الجھ رہا تھا کہ آخر یہ کس کا میسیج ہے، مگر کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔

دوسرے دن زندگی پھر اپنے معمول کے مطابق شروع ہوئی۔ گزرے دن کی الجھن ذہن سے رفع نہیں ہوئی تھی، مگر انھوں نے اب اس سے توجہ ہٹالی تھی۔ دفتر کے کام خود اتنے ہوتے ہیں کہ ایک بار آدمی ان میں مصروف ہو جائے تو پھر اِدھر اُدھر کی چیزوں کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ اسی انداز سے دن گزر رہا تھا۔ ساڑھے تین بجے وہ لنچ کے لیے اٹھے تو پھر اس میسیج کا خیال آیا۔ دفتر کے ایم ڈی اور ساتھی ڈائریکٹر کے ساتھ مل کر وہ لنچ کرتے تھے۔ وہ تینوں ذرا دیر سے لنچ کے عادی تھے۔ وہ اپنے کمرے سے نکلے تھے کہ اسی وقت دوسرے ڈائریکٹر صاحب بھی اپنے کمرے سے برآمد ہوئے۔ دونوں ایم ڈی صاحب کے کمرے میں آ گئے۔ گپ شپ کھانے کے ساتھ چلتی رہی۔ دفتر کی اور دُنیا کی کتنی ہی باتیں ہو جاتی تھیں اس وقفے میں۔

کھانے کے بعد واپس کمرے میں آ کر ایک فائل پر فنانس ڈائریکٹر کا نوٹ پڑھتے اور چائے پیتے ہوئے موبائل کی میسیج بیپ سن کر انھوں نے فون اٹھایا۔ اسی نمبر سے میسیج تھا جسے پڑھتے ہوئے ان کے چہرے سے تشویش کی لہر گزری:

ایم ڈی کے ساتھ کھانا کھانے کے بعد اب اپنے کمرے میں آ کر آپ چائے پی رہے ہوں گے اور اطمینان سے کوئی فائل دیکھ رہے ہوں گے۔

آخر یہ کون ہے جو اُن کے معمولات سے اتنا واقف ہے کہ اسے یہ سب کچھ معلوم ہے۔ انھیں الجھن بھی ہوئی، لیکن ساتھ ہی اپنائیت کا احساس بھی ہوا۔ واٹس ایپ کے اس اکاؤنٹ کے ساتھ پروفائل فوٹو نہیں آ رہا تھا، بلکہ اس کی جگہ برف پوش پہاڑوں کا منظر لگایا گیا تھا۔ انھوں نے سوچ کر ذہن میں لانے کی کوشش کی کہ ایسا ذوق کس دوست کا ہے، لیکن ذہن کا میجک بورڈ بالکل کورا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ جوابی میسیج کر کے پوچھیں کہ کون ان سے مخاطب ہے، لیکن یہ اُن کی عادت نہیں تھی۔ وہ کسی نامانوس نمبر سے فون کال ریسیو کرتے تھے اور نہ ہی ایسے کسی نمبر کے میسیج کو رپلائی کرتے۔ انھوں نے سوچا، کسی تجسّس کے اظہار کی کیا ضرورت ہے؟ جو بھی ہے اسے خود اپنا تعارف کرانا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ میسیج کرنے سے تو رُک گئے مگر اب ذہن پر مسلسل ایک بار سا ہو گیا تھا۔

تیسرے دن شیخ مجیب عالم خود اس نمبر سے میسیج کے منتظر تھے، لیکن شام ہو گئی اور اس طرف مکمل خاموشی تھی۔ ہفتے کے اختتامی دن یوں تو دفتر کے اوقاتِ کار ذرا پہلے ختم ہو جاتے تھے، لیکن وہ اس دن بھی روز کے وقت تک ہی بیٹھتے تھے کہ یہاں سے اٹھ کر وہ بڑی بہن کے یہاں جاتے۔ وہاں ایک ڈیڑھ گھنٹا گزارتے اور پھر اپنے گھر روانہ ہو جاتے۔ اس اضافی وقت میں اگر آفس کا کام نہ ہوتا تو ان کا وقت کمپیوٹر یا موبائل کے ساتھ ہی گزرتا۔ اس وقت جوں ہی انھوں نے موبائل اٹھایا عین اسی لمحے ایک میسیج کود گیا۔ انھوں نے سوچا، شاید اسی نمبر سے میسیج ہو۔ واقعی اسی نمبر سے تھا:

آج تو آپ کو بڑی بہن کے ہاں جانا ہوگا۔ یقیناً بہت خوش قسمت ہیں وہ کہ انھیں آپ جیسا خیال رکھنے والا بھائی ملا ہے۔ ہم بھی کبھی ان لوگوں میں تھے جنھیں آپ کی توجہ حاصل ہوتی تھی۔

شیخ مجیب عالم چکرا گئے۔ ارے بھئی ایسا کون ہے یہ شخص کہ جسے میرے بارے میں ہر بات معلوم ہے۔ اضطراری کیفیت میں انھوں نے ڈائل پیڈ کھولا اور نمبر ڈائل کرنے کا سوچا، لیکن پھر سر جھٹک کر فون رکھ دیا۔ کون ہے یہ جو اس طرح پہیلیاں بجھوائے جا رہا ہے اور اپنی واقفیت جتائے جا رہا ہے۔ یہ سب باتیں تو کوئی ایسا ہی شخص جان سکتا ہے جو بہت قریب رہا ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ ضرور کوئی خاتون ہیں۔ اپنی اس رائے پر انھیں خود ہنسی آ گئی۔ گویا وہ کہہ رہے تھے کہ اُن کے اتنے قریب کوئی عورت ہی آ سکتی تھی مرد نہیں۔ خیر جو بھی ہے، سامنے کیوں نہیں آ رہی وہ۔ انھوں نے جھنجھلا کے سوچا۔ موبائل نے پھر بیپ دی۔ اسی نمبر سے ایک اور میسیج تھا:

اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے فون میں ہمارا نام اور نمبر محفوظ نہیں ہے۔ آپ نے بھلا دیا ہمیں۔ حالاں کہ ہم یوں بھلا دینے والے تو نہیں تھے۔

وہ ابھی یہ میسیج پڑھ کر ہی بیٹھے تھے کہ ایک اور میسیج ٹپک گیا:

ہمیں معلوم ہے کہ آپ کو اس اجنبی نمبر کے میسیجز سے اب الجھن ہو رہی ہوگی۔ اگر یہ نمبر آپ کے موبائل میں نام کے ساتھ محفوظ ہوتا تو آپ یقیناً رپلائی کر چکے ہوتے۔ ہمارے کسی میسیج کا جواب اس لیے نہیں آیا کہ آپ کسی اجنبی نمبر کو رپلائی نہیں کرتے۔ سوچیے جب ہم آپ کے بارے میں اتنی باتیں جانتے ہیں تو ضرور آپ کے بہت قریب رہے ہوں گے نا۔

یہ میسیج پڑھ کر شیخ مجیب عالم واقعی پریشانی میں پڑ گئے اور اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی کوفت پیدا کر رہا تھا کہ اگر واقعی کوئی ایسا شخص ہے جس سے قریبی تعلق رہا ہے تو یہ خفت کی بات ہے کہ ذہن میں شخصیت اور موبائل میں نمبر کچھ بھی محفوظ نہیں۔ اتنی دیر میں ایک اور میسیج آ گیا:

چلیے خیر، کوئی بات نہیں۔ یہ دُنیا ہے اور یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔

میرا نام روبینہ ہے۔

خدا کے لیے اب یہ نہ پوچھ لیجیے گا، کون روبینہ؟

نام پڑھتے ہی شیخ مجیب عالم کو کرنٹ لگا، لیکن پھر اگلے ہی لمحے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی اور ایک پل میں سارا ذہنی تناؤ ختم ہو گیا۔ تھینک گاڈ! انھوں نے بلند آواز میں کہا۔ عورتیں، چہرے یا نام— کچھ بھی کہا جائے، اِس حوالے سے اُن کی

زندگی بہت بھرپور گزری تھی۔ عمر کا ہر موڑ حسین چہروں سے سجا ہوا تھا۔ ان کے یہاں یہ ایک طویل تاریخ، ایک بڑا ریکارڈ تھا۔ اس طویل تاریخ میں، لیکن روبینہ ایک ہی تھی۔ یہ صرف نام ہی ایک نہیں تھا، بلکہ روبینہ کی شخصیت، فکر اور والہانہ پن سب کچھ سب سے الگ تھا۔ انھوں نے سوچا، کسی سوشل گیدرنگ یا کسی پروفیشنل میٹنگ میں ملنے اور پھر قربت کے لمحات تک پہنچنے والے چہروں اور جسموں کی ساری چکا چوند مختصر ہوتی ہے۔ عام طور سے چند بار یا چند ہفتے اور اگر بہت زیادہ بھی چلے تو چند ماہ۔ اس کے بعد ایسے ستارے کسی نہ کسی وجہ سے مدار بدل لیتے ہیں۔ اس کے بعد جانے والے کو کوئی دیر پا رنج ہوتا ہے نہ پیچھے رہ جانے والے کو دائمی ملال۔ اپنے اپنے نئے مدار کی کہکشائیں دونوں کو پچھلا سب کچھ بھلا کر نئے دودھیا راستوں کی طرف متوجہ کردیتی ہیں۔ روبینہ کی شخصیت کی طرح اس کا معاملہ بھی مختلف ثابت ہوا۔ چند ہفتے، چند مہینے نہیں، یہ تعلق کئی برسوں تک چلا اور ایسے چلا کہ بس۔ کیسا زور تھا کہ ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ کیسی کشش تھی کہ ماند ہی نہ پڑتی تھی۔ شیخ مجیب عالم کی آنکھوں کے آگے سے ایک ایک کر کے رنگ برنگی ہنستی بولتی تصویریں گزرنے لگیں۔ انھوں نے میسج ریپلائی کرنے کے لیے فون اٹھایا، لیکن پھر نمبر ڈائل کر کے بات کرنے لگے۔

فون پر گفتگو اچھی رہی۔ وہی شائستہ آواز اور وہی اپنی طرف کھینچتا ہوا لہجہ۔ برسوں کی دُھند سے ایک ایسے چہرے کا اُبھر آنا جس کی خوش بو تیز بارش کے جھالے کی طرح ایک عرصہ ان پر برستی رہی تھی، شیخ مجیب عالم کو اچھا لگا۔ ایسے سب رشتوں کی طرح یہ رشتہ بھی فیڈ آؤٹ تو شکایتوں کے غبار ہی میں ہوا تھا، لیکن دوسروں کے برخلاف ایک بار پھر ابھر آیا تھا اور دوبارہ ابھرتے ہوئے اس پر کسی شکایت کی گرد تھی نہ کسی تردد کا غبار۔ وہ دوبارہ ساتھ گزرے ہوئے لمحات کو یاد کرنے لگے، تب انھوں نے سوچا کہ ساری باتیں ہوئیں، لیکن ملاقات کی خواہش یا فرمائش کا اظہار کسی طرف سے نہیں ہوا۔ چھپّن سال کا مرد ایک دم ایکسا ئیٹڈ نہیں ہوتا۔ انھوں نے خود سے کہا اور ہنس دیے۔

روبینہ سے اب روز چیٹنگ ہو رہی تھی۔ یکسانیت اور بوریت شیخ مجیب عالم کی زندگی سے ایک دم بالکل غائب ہوگئی تھی۔ اس کا اظہار اُن کے طرزِ عمل سے بھی ہو رہا تھا، جبھی تو کل ایم ڈی نے ان سے کہا کہ آج کل آپ زیادہ چارجڈ اور چیئرفل نظر آ رہے ہیں۔ مرد کی کیمسٹری بھی عجیب ہوتی ہے۔ ایک مہربان عورت اسے مکمل طور پر بدل کر رکھ دیتی ہے۔ انھوں نے سوچا۔ روبینہ سے چیٹنگ میں بہت ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ ہوتی تھی، جس میں کسی رومان کا کوئی رنگ نہ ہوتا، جسمانی قربت کے خیال کا تو سوال ہی کیا، لیکن پھر بھی شیخ مجیب عالم کو اس رشتے کا بحال ہونا اچھا لگ رہا تھا۔ روبینہ دو تین دن کے بعد واٹس ایپ پر لگایا گیا پروفائل فوٹو بدل دیتی۔ پہلے برف پوش پہاڑ تھے، پھر پھولوں کا تختہ لگا، اس کے بعد سمندر کی طوفانی موجیں آ گئیں۔

شیخ مجیب عالم نے پوچھا، ''آپ پروفائل میں اپنی تصویر نہیں لگاتیں؟''

جواب آیا، ''لگاتی ہوں۔''

''انھوں نے لکھا، ''لگایئے نا پھر، میں نے بہت دن سے آپ کو نہیں دیکھا۔''

چند منٹ بعد جواب آیا، ''لیجیے۔''

شیخ مجیب عالم نے دیکھا، تصویر میں وہی دل کش چہرہ تھا۔ تصویر تازہ معلوم ہو رہی تھی۔ زیادہ سے زیادہ سینتیس اڑتیس برس، انھوں نے عمر کا اندازہ کرتے ہوئے سوچا اور پوچھا، ''کب کی ہے یہ تصویر؟''

جواب آیا، ''پچھلے ہفتے کی۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ پہلے سے زیادہ حسین اور قاتل ہوگئی ہیں۔''

جواب میں ایک لمبا قہقہہ آیا۔

شیخ مجیب عالم بھی مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ خود سے بولے، خوب صورت ہی نہیں، بہت زندہ دل بھی ہے یہ عورت۔

تین دن بعد میسج پڑھتے ہوئے شیخ مجیب عالم نے غور کیا کہ پروفائل فوٹو پھر بدل گیا تھا۔ یہ تصویر تو کسی اور کی ہے، انھوں نے سوچا۔ بڑی کر کے دیکھی تو ایک دم جھٹکا لگا۔ نظریں تصویر پر جم کر رہ گئیں۔ یا خدا! کیا مطلب، یہ کیا ہے؟ وہ بڑبڑائے اور اُن کا ہاتھ بے اختیار پیشانی کی طرف بڑھا۔ وہ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے تھے، لیکن پیشانی پر پسینہ تھا۔ نگاہیں تصویر سے نہیں ہٹ رہی تھیں۔ یہ ایک چھ سات برس کی بچی تھی جو بالکل اُن کی سب سے چھوٹی بیٹی جیسی لگ رہی تھی۔ عفت کی چند برس پہلے کی یہ تصویر روبینہ کے پاس کیسے پہنچ گئی؟ یہ تصویر تو اُس کے فیس بک البم میں بھی نہیں ہے۔ انھوں نے سوچا۔ اس دُبدھا میں انھوں نے فیس بک لوگ ان کی۔ جلدی سے بیٹی کے اکاؤنٹ پر گئے اور اس کا فوٹو البم چیک کیا۔ یہ تصویر اس میں نہیں تھی۔ سخت اچنبھا تھا کہ یہ تصویر روبینہ کے ہاتھ کیسے لگی؟ صرف یہی ہے یا ایسی کچھ اور بھی چیزیں... یہ سوچتے ہوئے اچانک ایک خیال نے انھیں جھٹکا دیا اور شیخ مجیب عالم کا ہاتھ بے اختیار فون کی طرف بڑھا مگر اگلے ہی لمحے وہ رک گئے۔ اطمینان سے میسج دوبارہ پڑھا، اس کا جواب بھیجا پھر فوراً ایک اور میسج بھیجا جس میں پوچھا کہ یہ تصویر کس کی ہے؟

ترنت جواب آیا، ''کیا آپ پہچان سکتے ہیں؟''

وہ ایک لمحے کو چکرائے، کیا جواب دیں پھر بہت سنبھل کے لکھا، ''مجھے معلوم ہوتا تو پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ ویسے بہت سویٹ، بہت کیوٹ سی بچی ہے۔''

''کچھ اندازہ لگایئے نا۔ ویسے آپ کا یہ خیال درست ہے کہ بچی واقعی بہت کیوٹ ہے۔'' جواب آیا۔

''تو پھر اسے آپ کی بیٹی ہونا چاہیے۔''

''بالکل درست۔ میں اس کی ماں ہوں۔''

''ارے زبردست! بہت بڑی خبر ہے یہ۔ پارٹی ہونی چاہیے۔''

''ضرور، آپ جب کہیے پارٹی ہو جائے گی۔''

''بہت شکریہ۔ ماشاءاللہ بہت پیاری ہے۔ اور کتنے بچے ہیں؟''

''یہی ہے اکلوتی۔''

''ماشاءاللہ! سلامت رہے۔''

''شکریہ۔ لیکن آپ نے آدھا پہچانا ہے ابھی، یعنی ماں کا بتایا ہے، ذرا باپ کو بھی پہچانیے۔''

شیخ مجیب عالم بہت سنبھل کر اور نورمل نظر آنے کی کوشش میں چیٹنگ کر رہے تھے، لیکن اندر سے وہ خوف زدہ تھے اور سارا خوف اسی ایک سوال کا تھا۔

انھیں ایک لمحے تو سمجھ ہی نہ آیا کہ کیا جواب دیں پھر ذرا سنبھلے اور لکھا، ''ہاہاہاہاہا! ارے آپ کے خیال میں کیا ہم آپ کے شوہر نامدار کو بھول چکے ہیں؟''

''نہیں، وہ نہیں ہیں۔'' مختصر اور سنجیدہ جواب آیا۔

''ارے یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ ایسا مذاق کرتے ہیں بھلا؟''

''میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔ یہ آپ کی بیٹی ہے۔ تصویر کو ایک بار ذرا غور سے دیکھیے، آنکھیں، ماتھا، ناک، ہونٹ سب کتنے ملتے ہیں آپ سے۔ آپ کے پاس اپنے بچپن کی کوئی تصویر ہو تو اس سے ملا کر دیکھیے۔''

''ہاہاہا! اتنا بڑا کریڈٹ دیا جا رہا ہے مجھے۔''

چیٹنگ ختم ہو گئی تھی مگر شیخ مجیب عالم دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے تھے، اس لیے کہ ان کی چھٹی حس کہہ رہی تھی، یہاں سے ایک نئی کہانی شروع ہونے جا رہی تھی۔ اوہ مائی گاڈ! یہ معاملہ آگے کہاں تک پہنچے گا، اس خیال سے ہی سر چکرا گیا۔ کمرہ گھومتا ہوا نظر آنے لگا۔ کیا چاہتی ہے یہ عورت؟ کیا یہ اب مجھے بلیک میل کر کے رقم ہتھیانا چاہتی ہے؟ کتنی رقم؟ اِس کا منہ بند رکھنے کے لیے اگر میں ایک بار رقم دے بھی دوں تو کیا یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا؟ نہیں، یہ تو عمر بھر کی بلیک میلنگ کا معاملہ ہے۔ جوان اولاد، خاندان، سماجی حیثیت، عمر کا یہ حصّہ ــــ افوہ! انھیں جھرجھری آ گئی۔ اچھا تو یہ عورت اتنے برسوں کے بعد اس لیے رابطے میں آئی ہے مجھ سے۔ اُن کا دل بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں انھیں کیسی اور کتنی قیمت چکانی پڑے گی، انھوں نے سوچا۔ کیا انھیں یہ ماننے سے انکار کر دینا چاہیے کہ اُن کا اس عورت سے کبھی ایسا کوئی رشتہ رہا ہے کہ جس کا یہ نتیجہ نکلے؟ لیکن کیا ان کے انکار سے مسئلہ حل ہو جائے گا؟ لوگ ان کی بات کا یقین کر لیں گے؟ کیا یہ عورت اُن کے مکر جانے پر مایوس ہو کر بیٹھ جائے گی؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ زخمی ناگن بن جائے۔ ان کا سوشل اسٹیٹس تو اس مسئلے کو میڈیا کے لیے خبر بنا دے گا۔ اگر بات ڈی این اے چیک اپ تک پہنچ گئی تو ــــ اوہ خدایا! کیا ساری عمر کی عزت خاک میں مل جائے گی؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے، ہرگز نہیں۔ چاہے اس کے لیے انھیں کوئی بھی قیمت چکانی پڑے۔ یہ عورت کیا ڈیمانڈ کر سکتی ہے؟ پھر انھیں خیال آیا کہ روبینہ کا تعلق تو خود کھاتے پیتے گھرانے سے ہے۔ اس کا میکا اور سسرال دونوں خوش حال خاندان ہیں۔ شوہر خود بہت اچھی حیثیت کا آدمی ہے۔ کیا اس کے حالات خراب ہو گئے ہیں؟ کیا یہ شوہر سے الگ ہو گئی ہے؟ آخر کس وجہ سے رابطہ کیا ہے اس نے؟ کیا چاہتی ہے مجھ سے؟ شیخ مجیب عالم کے ذہن میں سوچوں کے اور سوالوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔

اس گفتگو کے بعد کئی دن گزر گئے تھے، لیکن روبینہ کی طرف سے کوئی ڈیمانڈ سامنے نہیں آئی تھی۔ وہ روز اُن کے ساتھ معمول کے مطابق چیٹنگ کر رہی تھی۔ ایک بار فون پر بات بھی ہوئی، لیکن ایسا کوئی اظہار نہیں ہوا تھا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، شیخ مجیب عالم کا ذہنی دباؤ بڑھ رہا تھا۔ ویسے تو وہ بھی روبینہ سے نورمل انداز سے پیش آ رہے تھے اور ایسا کوئی تأثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ انھیں اس خبر سے کوئی پریشانی ہوئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ سخت ڈپریشن میں تھے اور دو دن سے تو باقاعدہ اِس کی دوا لینے لگے تھے۔ اس لیے کہ ان کا ذہن بار بار خودکشی اور اس عورت کے قتل کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔ اندر کی شدید گھٹن کا احساس آخر انھیں ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ دوا سے انھیں زیادہ افاقہ تو نہیں تھا، لیکن ڈاکٹر نے تاکید کی تھی کہ دوا پابندی سے اور اس وقت تک لینی ہے، جب تک وہ خود اُن سے بند کرنے کے لیے نہ کہے۔

آخر بلی کے تھیلے سے باہر آنے کا وقت آ ہی گیا۔ روبینہ نے ان سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ انھوں نے اسی شام کے لیے ہامی بھر لی۔ وہ چاہتے تھے کہ جو بھی ہونا ہے بس اب فوراً ہو جائے۔ گومگو کی اس کیفیت نے انھیں بری طرح تھکا دیا تھا، بیمار کر دیا تھا۔ وہ اب فوراً مسئلے کی تہہ تک پہنچنا چاہتے تھے۔ کئی بار انھوں نے سوچا کہ وہ خود ملنے کی خواہش کا اظہار کریں، لیکن یہ سوچ کر رک گئے کہ اس طرح تو روبینہ پر ان کی بے چینی اور خوف کا راز کھل جائے گا اور پھر یہ عورت انھیں اپنی شرائط اور منہ مانگی قیمت پر مجبور کرے گی۔ اس لیے وہ اُسی کی طرف سے ملاقات کی خواہش کے اظہار کا انتظار کر رہے تھے اور جوں ہی یہ سوال کیا گیا انھوں نے یہ تأثر دیتے ہوئے کہ وہ بھی اپنی پرانی دوست سے ملنے کو بے چین ہیں، فوراً آمادگی ظاہر کر دی۔

روبینہ اب بھی سلم، اسمارٹ اور اسی طرح پُرکشش تھی۔ انھوں نے ملاقات کا آغاز اسی فقرے سے کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے آج ان کی توجہ کسی اور چیز پر نہیں بس ایک ہی نکتے پر مرکوز تھی۔ روبینہ بچی کو بھی اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔ بچی بہت معصوم اور پیاری تھی، لیکن اسے دیکھ کر اُن کی وحشت بڑھ گئی تھی۔ وہ ہو بہ ہو اُن کی چھوٹی بیٹی جیسی تھی، جیسے بنانے والے نے دو صورتیں ایک جیسی بنائی ہوں، دونوں میں اگر کوئی فرق تھا تو بس چار پانچ برس کی عمر کا تھا۔ سارا خاندان کہتا تھا کہ وہ شیخ مجیب عالم کی ٹرو کاپی ہے۔ یا خدا! اگر یہ بچی اُن کی بیٹی کے ساتھ بٹھا دی جائے تو کسی ڈی این اے ٹیسٹ کے بغیر ہی یہ ثابت ہو جائے گا کہ دونوں سگی بہنیں ہیں۔ شیخ مجیب عالم کے پیٹ میں ایک بگولا سا گھوم گیا۔

ملاقات گھنٹے بھر سے جاری تھی۔ کافی، اسنیکس، باتیں، مذاق، قہقہے سب کچھ ہو چکا، لیکن روبینہ کے ہونٹوں پر وہ بات اب تک نہیں آئی تھی، جس کے شیخ مجیب عالم منتظر تھے۔ وہ خود کو بالکل بے بس محسوس کر رہے تھے اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ اس دوران میں اس عورت نے ان سے جتنی باتیں کی ہیں، وہ سب کی سب اس خبر کے ان پر اثر کا اندازہ لگانے کے لیے کی گئی ہیں اور یہ قیاس کرنے کے لیے کہ وہ اس بلیک میلنگ میں ان سے کتنی رقم بٹور سکتی ہے۔ خیر، انھوں نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی تھیں۔ وہ اس سے بہت اطمینان سے اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے کئی بار اس بات کو دُہرایا تھا کہ وہ ان دنوں مالی بحران کا شکار ہیں۔ پہلے ایک کاروبار میں بڑی رقم لگا کر نقصان اٹھایا، اس کے بعد والدہ اور پھر بیوی کی بیماری پھر کچھ اور خاندانی مسائل نے انھیں مالی تنگی میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس پر روبینہ نے افسوس کا اظہار کیا اور دعا کی کہ وہ جلد اس کرائسس سے نکل آئیں۔ آخر گھڑی دیکھتے ہوئے وہ بولی، ''اب چلنا چاہیے۔ مجھے تو ابھی راستے میں پنکی کے لیے کچھ خریداری بھی کرنی ہے۔''

''اچھا دیکھ لیجیے، جیسے آپ کی مرضی۔'' شیخ مجیب عالم نے بھی گھڑی دیکھی۔

''آپ پوچھیں گے نہیں کہ میں آپ سے ملنا کیوں چاہتی تھی؟''

شیخ مجیب عالم کا چہرہ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ انھوں نے خود کو سنبھالتے ہوئے قہقہہ لگایا اور بولے، ''اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے۔ مجھے معلوم ہے، آپ کا دل چاہا کہ ملاقات ہو، جیسے میرا دل چاہ رہا تھا اور بس آپ آ گئیں۔''

روبینہ نے اثبات میں سر ہلایا اور بولی، ’’اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔‘‘

شیخ مجیب عالم کے دل کی حرکت ایک دم آہستہ ہوگئی۔ انھوں نے گہرا سانس لیا اور بولے، ’’اچھا— وہ کیا؟‘‘

’’میں پنکی کو آپ سے ملانا چاہتی تھی۔‘‘

’’پنکی بہت پیاری بچی ہے۔ اس سے مل کر بہت اچھا لگا، بہت خوشی ہوئی۔ آپ کا شکریہ کہ آپ نے اس سے ملاقات کروادی۔‘‘

پنکی اُن دونوں سے بے نیاز اپنی ماں کے موبائل پر کوئی گیم کھیلنے میں مصروف تھی۔

’’میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ ملاقات بہت ضروری ہے۔‘‘ روبینہ ایک لمحے کے لیے رُکی۔ شیخ مجیب عالم اسے سانس روکے دیکھ رہے تھے۔ وہ پھر بولی، ’’اصل میں اگلے ہفتے ہم لوگ کینیڈا جا رہے ہیں۔‘‘

’’کیا مطلب؟‘‘ شیخ مجیب عالم کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔

’’امیگریشن کے لیے اپلائی کیا ہوا تھا، وہ مل گئی ہے۔ سب کام ہو گئے ہیں، بس اب اگلے ہفتے ہم لوگ وہاں شفٹ ہو جائیں گے۔‘‘

’’اچھا— پوری فیملی— ہمیشہ کے لیے؟‘‘

’’جی!‘‘ روبینہ کی آنکھیں اُن کے چہرے پر تھیں۔ ’’میرا جی چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے کم سے کم ایک بار آپ کی بیٹی کو آپ سے ضرور ملوا دوں۔‘‘ شیخ مجیب عالم کو کچھ سمجھ نہ آیا کہ وہ جواباً کیا کہیں۔ وہ مسکرا کے رہ گئے۔

روبینہ خاموشی سے اُن کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈ اس کی آنکھیں ان کے چہرے پر رُکی رہیں۔ شیخ مجیب عالم کو لگا جیسے کتنے برسوں سے وہ اُن کے چہرے کو تکے جا رہی ہے اور کوئی دروازہ تلاش کر رہی ہے جو اُسے اُن کے اندر لے جا سکے۔

گھڑی دیکھتے ہوئے روبینہ اٹھی لیکن پھر فوراً ہی بیٹھ گئی۔ ’’ایک بات اور کہنی تھی آپ سے۔ میرے پاس کچھ تھوڑے سے پیسے ہیں۔ اپنا اکاؤنٹ نمبر مجھے ٹیکسٹ کر دیجیے، آن لائن ٹرانسفر کرا دوں گی۔ آپ فنانشلی کچھ پریشان لگ رہے ہیں ان دنوں۔ بہت زیادہ تو نہیں ہیں، شاید پچّیس لاکھ تک میں ٹرانسفر کرا دوں گی آپ کے اکاؤنٹ میں۔ کچھ آسانی ہو جائے گی آپ کو۔‘‘ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

شیخ مجیب عالم بالکل گنگ اس کا چہرہ دیکھ رہے تھے۔ اُس نے اُن سے ہاتھ ملایا اور بچی کا بازو تھام کر چل دی۔ شیخ مجیب عالم کچھ کہنا چاہتے تھے، اس کے ساتھ ہی وہاں سے اٹھنا چاہتے تھے، لیکن انھیں لگا وہ گھٹنوں تک زمین میں دھنسے ہوئے ہیں۔ ●●

غزل

مبین مرزا

چاہت سے دیکھیے کہ عداوت سے دیکھیے
دنیا ہے بس یہی کسی نسبت سے دیکھیے

لمحوں میں کھل نہ پائیں گی اِس کی لطافتیں
گر دل کو دیکھنا ہے تو فرصت سے دیکھیے

منظر بدل دیا ہے تغافل نے آپ کے
اب جس طرف بھی دیکھیے ، وحشت سے دیکھیے

بازارِ زیست میں ہیں بلند اس ادا کے دام
ہر شخص کو یہاں اِسی نخوت سے دیکھیے

جو کچھ بھی مل چکا اُسے قدموں سے روند کر
جو کچھ نہیں ملا اُسے حسرت سے دیکھیے

وصل و فراق مت اِسے گردانیے حضور
یہ اور مرحلہ ہے ، سو ہمت سے دیکھیے

رنجیدہ ہو چکے ہیں بہت آپ کے اسیر
اب کچھ لحاظ کیجیے، مروّت سے دیکھیے

یہ عشق ہے تو سیکھیے آدابِ عشق بھی
یوں بزم میں نہ یار کو رغبت سے دیکھیے

غزل

مبین مرزا

فغاں کہ نذرِ طلسم زمانہ ہوگئے ہیں
ہم ایسے لوگ بھی آخر فسانہ ہوگئے ہیں

جہاں پہ پہنچے تھے اک روز طمطراق کے ساتھ
بہ حسرت آج وہاں سے روانہ ہوگئے ہیں

تو کیا ہوئی وہ تمنا کی دولتِ بیدار
کہ سارے شوق ہی رسمِ شبانہ ہوگئے ہیں

وہ لوگ جن کا طلب گار اک زمانہ تھا
کسی کی سادہ دلی کا نشانہ ہوگئے ہیں

کسی کی چشمِ گریزاں کو جن سے نسبت ہے
بُرا نہیں کہ وہ غم جاودانہ ہوگئے ہیں

اب اس قدر نہیں خالی ہمارا دامن بھی
گناہ ہم سے بھی کچھ فاخرانہ ہوگئے ہیں

جو مثل ابرِ بہاراں ہیں دوسروں کے لیے
وہ لوگ اپنے لیے تازیانہ ہوگئے ہیں

کچھ اور شے ہے کہ جس نے گھلا دیا مجھ کو
کہ یہ عوارضِ جاں تو بہانہ ہوگئے ہیں

زندہ اور متحرک ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ

ثالث

مدیر اعزازی

اقبال حسن آزاد

مدیر

ثالث آفاق صالح

قیمت فی شمارہ: ۱۵۰ روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۱۵۰ روپے)
سالانہ: ۶۰۰ روپے (رجسٹرڈ ڈاک سے ۷۰۰ روپے)
خصوصی تعاون: پندرہ ہزار روپے یا تین سو امریکی ڈالر
جن ممالک میں western union یا منی گرام کی سہولت ہے وہاں سے درج ذیل پتے پر رقم بھیجی جاسکتی ہے۔
TMCN اور دیگر تفصیلات درج ذیل ای میل پر بھیجی جاسکتی ہے۔
eqbalhasan35@yahoo.com
سالانہ ممبر شپ کے لیے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائز بینک کے کسی بھی برانچ کے ذریعے درج ذیل اکاؤنٹ میں رقم بھیجی جاسکتی ہے۔

Eqbal Hsan Azad
Allahabad Bank
Jamalpur Branch
A/c 20962191966
IFSC Code- ALLA0210009
Mob.+91 9430667003
email:eqbalhasan35@yahoo.com
www.salismagazine.in

حقوق نسواں کا پہلا علمبردار

ابن رشد

(1126-1198)

زکریہ ورک

(Science Historian / author/ translator of 22 books)

ابو ولید محمد ابن رشد کی ولادت باسعادت قرطبہ کے معزز، معروف اور فقہاء کے خاندان میں ہوئی تھی۔ آپ آزادی نسواں کے یورپ میں پہلے علمبردار تھے۔ عہد وسطیٰ کے یورپ کو آپ کے آئیڈیاز نے زبردست رنگ میں متاثر کیا۔ مثلاً یورپ میں تیرھویں صدی میں لوگ خیال کرتے تھے کہ موت کے بعد روح قبر کے ارد گرد منڈلاتی رہتی ہے یا جہنم کے عذاب میں ڈال دی جاتی۔ ابن رشد کا نظریہ تھا کہ روح مادے سے الگ جوہر ہے جس پر جسمانی نہیں بلکہ روحانی عذاب نازل ہوتا ہے۔ یوں لوگوں نے رفتہ رفتہ قبول کرلیا کہ روح مادی چیز نہیں بلکہ روحانی چیز ہے۔ روح ابدی ہے جو موت کے بعد ایسے جسم میں داخل ہوگی جو پہلے دنیوی جسم سے مشابہ ہوگا۔ جو جسم ایک بار فنا ہوجائے وہ دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتا۔

وہ مسلمان سائنسدان اور دانش ور (الفارابی، ابن سینا، ابن الہیثم، ابن باجہ) جنہوں نے اسلامی روایات اور یونانی فکر کو منطبق کرنے کی کوشش کی ان میں سے آپ آخری دانشور تھے۔ آپ موطا امام مالک کے حافظ تھے۔

ابن رشد فنا فی العلم تھے۔ حصول علم کا شوق دل میں شعلے کی مانند فروزاں رہتا تھا۔ ساری عمر کتابوں کے مطالعہ میں مشغول رہے۔ جس طرح البیرونی کہتے تھے کہ ان کی تصنیف کردہ کتابیں ان کے بچوں کی مانند ہیں کچھ یہی حال ابن رشد کا تھا۔ رات کے وقت جب سونے کا وقت ہوتا ان کے ہاتھ میں کتاب ہوتی تھی۔ ۱۹۹۹ء میں راقم الحروف نے قرطبہ کی سیاحت کے دوران ان کا مجسمہ یہودیوں کے محلے میں دیکھا تھا جس میں انہوں ہاتھ میں کتاب تھامی ہوئی ہے۔ کتاب الدیباج الذہب کے مصنف انصاری کا کہنا ہے کہ ابن رشد پر زندگی میں دو راتیں ایسی آئیں جب وہ مطالعہ سے محروم رہے۔ ایک رات جب ان کے والد محترم کی رحلت ہوئی اور دوسری رات جب ان کی شادی ہوئی تھی۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں حقوق نسواں اور آزادی نسواں کا ہر طرف چرچا ہے، خاص طور پر یورپ و امریکہ میں ویمنز لب پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ اس ضمن میں یہ تسلیم کرنے میں مفر نہیں کہ اس تحریک نے خواتین کیلئے حقوق اور آزادی کی جو جنگ لڑی ہے وہ کامیابی سے ہمکنار ہوئی ہے۔

لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے حقوق نسواں کے آئیڈیا نے کہاں جنم لیا تھا؟ اس آئیڈیا کو پیش کرنے والا کون تھا؟ ہمارے نزدیک یورپ میں حقوق نسواں کا سب سے پہلا علم بردار ابن رشد قرطبی تھا۔ افلاطون کی کتاب الجمہوریہ (جوامع سیاسیۃ افلاطون) کی شرح متوسط میں ابن رشد نے فرمایا عورتیں تمام معاملات میں مردوں کے مساوی ہیں۔ تسلیم کہ وہ فطری طور پر کمزور اور نازک اندام ہوتی ہیں۔ امن اور جنگ میں مردوں اور عورتوں کی قابلیتیں ایک جیسی ہیں۔ اس دعویٰ کی دلیل کے طور پر انہوں نے بربر، افریقن، یونانی اور عرب جنگجو عورتوں کی مثال پیش کی۔ انہوں مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے معاشرے میں عورتوں کا مقام افلاطون کی جمہوریت میں دئے گئے شہری مساوات کے برابر کا نہیں ہے۔ عورتوں کو بچے جنم دینے، دودھ پلانے اور ان کی پرورش کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو کہ ملک کی اقتصادیات کیلئے منفی اثرات کا حامل نیز ریاست کی غربت کا اصل سبب ہے۔ ابن رشد کے نزدیک عورتوں میں فلاسفر بن سکتیں اور حکمراں ہوسکتی ہیں۔ البتہ عورت نماز میں مردوں کی امامت نہیں کراسکتی ہاں عورتوں کی امامت کراسکتی۔

ابن رشد نے مزید کہا کہ ہمارے معاشرے کو بہتر سے بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ہماری سوسائٹی میں عورتوں کو ہنر اجاگر کرنے کی کوئی جگہہ نہیں ہے۔ بچوں کو جنم دینا اور ان کی نگہداشت کرنا ان کا مقدر بن چکا ہے۔ اس غلامی کی حالت (یا ذہنیت) نے ان میں بڑے کام کرنے کی اہلیت سلب کردی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی عورت ایسی نہیں جس میں پراز حکمت خوبیاں ودیعت کی گئی ہوں۔ وہ جڑی بوٹیوں کی طرح بے سود زندگیاں گزارتی ہیں۔ اپنے شوہروں کیلئے انہوں نے خود کو غلام بنا رکھا ہے۔ اس سے وہ زبوں حالی جنم لیتی جو ہمارے شہروں میں عام ہے کیونکہ عورتیں مردوں سے دوگنا سے زیادہ ہیں. لیکن ضروریات زندگی وہ اپنی محنت مزدوری سے پوری نہیں کرسکتیں"۔

برطانوی مصنف طارق علی ہمارے اس نقطہ نظر کی تائید میں ابن

رشد کی زندگی کے اس پہلو کے متعلق لکھتے ہیں:

The first Muslim philosopher to give serious thought to the structural defects of Islam in relation to women was ibn Rushd from Cordova. often denounced as a zindiq (heretic) he never retracted on the women question. His open thinking predated the invention of Europe , and therefore did not come from but, in time would go to Europe that was created by the renaissance. Ibn Rushd argued that 500 years of segregation had reduced the status of women to that of vegetables. (Tariq Ali, The Clashes of Fundamentalism, 2002, page 62)

ترجمہ: پہلا مسلمان فلاسفر جس نے سنجیدگی سے عورتوں کے متعلق اسلام کے نقص کو بیان کیا وہ قرطبہ کا ابن رشد تھا۔ اس کو اکثر زندیق کہہ کر مزمت کی گئی لیکن عورتوں کے متعلق وہ اپنا نقطہ نظر سے کبھی بھی باز گردنہ ہوا۔ اس کی فکر یورپ سے بہت پہلے کی تھی اور اسلئے یہ آزادی فکر کی تحریک یورپ سے نہیں آئی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ یورپ پہنچی جو نشاۃ ثانیہ سے وجود میں آیا تھا۔ ابن رشد نے دلیل دی کہ پانچ سو سال کی علیحدگی نے عورت کا مقام محض ترکاری تک محدود کر دیا تھا۔

اندلس کے معاشرے میں عورت مرد کی جائیداد تصور کی جاتی تھی۔ مرد ایک سے زیادہ شادیاں کر سکتا اور جب چاہے طلاق دے سکتا تھا۔ عورت کیلئے خلع لینا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ عورتوں میں علمی کام کرنے کی استعداد مفقود ہو چکی تھی۔ کوئی عورت فقیہ، قاضی، استاد، مصنف یا حکمراں کہیں ڈھونڈے سے بھی ملتی نہ تھی۔ ابن رشد نے حقوق نسواں اور آزادی نسواں کا علم ایک ہزار سال قبل بلند کیا تھا۔ جس وقت حکومت، عدلیہ، انتظامیہ میں مرد ہی مرد تھے۔ خلیفہ گویا مطلق العنان حکمراں تھا۔ آمریت اور فسطائیت کا دور دورہ تھا۔ حقوق نسواں کی بات کر کے ابن رشد نے فریڈم آف سپیچ (آزادی فکر) کا اعلان اور جرات رندانہ کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اپنے دور میں رہتے ہوئے ایک ہزار سال وقت سے آگے تھے۔

عورت اور موسیقی میں تعلق

عورتوں کے بارے میں ابن رشد کے آئیڈیاز ان کی کتاب بدایۃ المجتہد اور افلاطون کی کتاب سیاست کی شرح میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً تلخیص السیاسۃ لافلاطون (بیروت 1998ء) میں وہ افلاطون کا نام لئے بغیر ایسی باتیں کہتے جن کو ان سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ تاھم انہوں نے افلاطون کے تمام نظریات سے اتفاق نہیں کیا تھا۔ درج ذیل اقتباس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک عورتیں ہی موسیقی کو سمجھ سکتیں اور اس کا بہتر مصرف پیدا کر سکتیں۔ عورتوں میں شاندار موسیقار بھی پیدا ہو سکتے بلکہ عورتوں میں موسیقی کو سمجھنے کی بہتر صلاحیت موجود ہے۔ کتاب میں صفحہ 96، باب 14 میں وہ عورت اور موسیقی میں مشابہت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

جہاں تک سر تال یا آہنگ کا تعلق ہے بہتر ہے کہ اس کو عورتوں اور دوسرے عوام سے منتخب کیا جائے اور اس سر تال کو روح میں جوش ولولہ کو مزید تقویت دینے میں استعمال کیا جائے۔ اگر چہ یہ سر تال افلاطون کے دور میں معین ہو چکے تھے، تاھم لازمی ہے کہ ہم ان کی تلاش اپنے دور میں بھی کریں۔

"Concerning rhythm it is appropriate to choose that which is selected from women and other people, and use that thythm to enhance the courage of the soul. And even if those rhythms are more defined in Plato's time, it is however, important that we search for it in our time." (section 14, page 96)

پھر تلخیص کے باب 26 صفحہ 123 میں وہ کسی معاشرے میں نیکیوں کے اقسام بیان کرنے کے بعد وہ زعماء کے مقام، نیز یہ کہ آیا شہر کے اکابرین اپنی عورتوں کی ایسی مخصوص کمیونٹی ہونی چاہئے جن میں سے وہ بچے پیدا کر سکیں، ابن رشد اپنا نقطہ نظر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"اگر ہم اکابرین کی کوالٹی کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں ان بچوں کی ولادت کے ذریعہ جوان سے مشابہت رکھتے ہیں، تو ایسا کرنا محال ہوگا کہ وہ بالفعل ان بچوں کو ہر کس و ناقص عورت سے حاصل کر لیں۔ اس کے برعکس ان کو صرف ایسی عورتوں سے شادی رچانی چاہئے جو قابلیت میں ان جیسی ہوں، اور ان کی پرورش ان کے جیسے ماحول میں ہوئی ہو۔ اس کا اطلاق صرف علی الخصوصا کابرین پر ہی نہیں ہوتا بلکہ ریاست کے تمام عوام الناس پر ہوتا ہے"۔

اسکے بعد ابن رشد عورتوں کے قابلیت کو موضوع بحث بناتے ہیں۔ وہ عورتوں کی قابلیت کو مردوں کی قابلیت کے مساوی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک عورت جنگ میں حصہ لے سکتی، عدالت میں فیصلے دی سکتی، حکومت کی سربراہ ہو سکتی۔

ابن رشد کی تصنیف بدایۃ المجتہد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا کہ ان کے تمام عدالتی فیصلے، تجزئے اور فتاوئ جمہور العلماء (اسلامک سکالرز) سے متفق الرائے تھے۔ لیکن ایسے فیصلے جن کا تعلق عورتوں سے تھا ان میں ماڈریشن پائی جاتی ہے۔ فیصلہ دیتے ہوئے وہ کسی بھی موضوع پر تمام آراء کو پیش کرتے لیکن آخری الفاظ میں وہ دلائل بھی دے دیتے۔ ابن رشد کو سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں تھا ان کا اصل مشن تو فلسفہ تھا۔ افلاطون کی کتاب ری پبلک کی تلخیص میں افلاطون کے نظریات کیساتھ انہوں نے اپنے سیاسی خیالات پیش

کئے تھے۔ دراصل اس تلخیص کے ذریعہ انہوں نے اس دور کے اسلامی معاشرے میں پائے جانیوالے مسائل سے اتفاق یا ان سے اختلاف رائے کا اظہار کیا تھا۔ اس شرح میں ان کو موقعہ مل گیا کہ وہ غیر اسلامی نقطہ ہائے نظر کو بھی افلاطون کے نظریات پیش کرتے ہوئے بیان کر سکے۔

عورت الغزالی کی نظر میں

ارسطو اور غزالی کے نقطہ نظر کے مطابق مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہے۔ ارسطو اور ابو حمید الغزالی کی نگاہ میں عورت کا معاشرے میں سب اچھا کردار بچوں کی نگہداشت کرنا ہے، اور یہ کہ گھر کے کام کاج کیلئے عورت ہی زیادہ موزوں ہے۔ ارسطو نے اس لحاظ سے عورت کو مثبت رول دیا تھا جبکہ الغزالی کے نزدیک یہ رول منفی تھا۔ حجۃ الاسلام کے نزدیک عورت مرد کے ماتحت ہوتی، ان کے نزدیک شادی کے بعد عورت مرد کی غلام ہو جاتی ہے۔ ارسطو کے نزدیک ایک اچھے خاندان کی بنیاد عورت ہوتی ہے۔ جبکہ غزالی کے خیال میں گھرانے میں صرف ایک ماسٹر ہو سکتا اور تابعدار بیوی۔ غزالی کے نزدیک عورت کیلئے تعلیم بے سود تھی اسلئے گھر سے باہر عورت کے مفروضہ کام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ غزالی اپنی تالیف نصیحۃ الملوک میں فرماتے ہیں:

جب تک کوئی عورت خدا کے احکامات پر عمل کرتی اور اپنے شوہر کی تابعدار رہوتی، وہ چرخے کو ہاتھ میں پکڑتی اور چلاتی، یہ ایسا ہے جیسے وہ اللہ کے اسماء حسنیٰ کا ورد کر رہی ہو، نماز میں شامل ہو رہی ہو اور غیر مسلموں کے خلاف جدال میں مصروف ہو۔ جب تک کوئی عورت چرخہ کاتتی رہتی گویا اس کے گناہ دھو دئے گئے۔ چرخہ کاتنا عورت کیلئے جائے پناہ اور محفوظ مقام ہے۔ تین قسم کی صدائیں اللہ کے عرش تک پہنچتی ہیں۔ (۱) کافروں کے خلاف تیر کمان تیار کرنے کی صدا (۲) عالم کے قلم کی صدا (۳) نیک عورتوں کے چرخہ کاتنے کی صدا۔

Nasihatul Maluk, pp 158-173 Eng. Trans.

نصیحتہ الملوك کے آخری باب ہفتم 'عورتوں کے اچھے اور برے پہلو' (فارسی: اندر صفت زنان و خیر و شر ایشان) میں غزالی تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کی اکثریت عورتوں پر انحصار کرتی کیونکہ وہ اولاد جنم دیتی ہیں، نسل انسانی ان سے چلتی ہے۔ لیکن یہ مردوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ رفیق حیات کے انتخاب اور بیٹیوں کو شادی میں دیتے وقت تحفظ کے تمام پہلوؤں کو مدنظر رکھیں۔ بادشاہ کو نصائح کرتے ہوئے وہ عورتوں کی تشبیہ کے ذریعہ اخلاق اور کردار سازی کے معاملات کی وضاحت کرتے جیسے بخیلی، بددلی، غصے میں آجانا، اور عورتوں کی شہوت بازی۔ کتاب کے شروع میں وہ مردوں کو عورتوں سے متعلق تنبیہ کرتے اور ضرر و نقصان جو ان کے ذریعہ پہنچ سکتا۔ منفی اوصاف کی مثالیں دیتے ہوئے وہ بادشاہ کو نصیحت کرتے کہ اگر وہ ان اوصاف کا حامل ہوگا تو اسکا رویہ عورتوں کی طرح ہوگا۔

فارسی: خداوند کتاب گوید کہ آبادانی جہان و نسل آدمی از زنان است۔ و آبادانی ھرگز بی رای و تدبیر راست نیاید، و گفتہ اند کہ شاورو ھن و خالفوھن۔ و واجب است ہر مردم دانا و ھشیار کہ احتیاط کند در کار زن خواستن و دختر بہ شوھر دان، خاصہ کہ دختر رسیدہ گشت تا بہ عار و عیب و درد سر نیفتد۔

(نصیحتہ الملوک، تہران 1989، چاپ اول جامی، صفحات 222-219)

اسی کتاب کے صفحہ 227 پر یہ تحریر پڑھئے اور شرم سے سر جھکا دیجئے: آپ لکھتے ہیں:

عورتوں میں دس جانوروں کے مزاج اور صفات ہوتے ہیں جیسے سؤر، سگ، چوہے، عقرب، فاختہ، بھیڑیا اور بھیڑ۔ (فارسی: چون خوک، چون کپی، چون سگ، چون مار، چون استر، چون کژدم، چون موش، چون کبوتر، چون روباہ، چون گوسفند)۔

عربی میں لکھی کتاب کسر الشھواتین میں صفحہ 12 پر لکھتے ہیں:

عورتیں شیطان کا پھندہ ہیں، اگر (مرد) میں یہ جنسی خواہش نہ ہوتی تو عورتیں مردوں پر کبھی بھی حکمرانی نہ حاصل کر سکتیں۔

شیخ احمد سرہندی کا ارشاد

ہندی صوفی عالم دین شیخ احمد سرہندی (1624) نے خدا تعالیٰ کی طرف سے مردوں پر خصوصی عنایات کا دعویٰ کیا۔ انہوں نے مردوں کو چار عورتوں سے شادی کرنے، حسب منشاء لونڈیاں رکھنے، اور طلاق کے ہتھکنڈے کو استعمال کرتے ہوئے بیویوں کو بدلنے کی اجازت دی۔ کیونکہ عورتیں کی ساری زینت باری تعالیٰ کی جناب سے محض مردوں کے لطف اندوز ہونے کی غرض سے عطا کی گئی ہے۔۔۔ چونکہ عورتوں کی فطرت اتنی مکار ہے اس لئے ہر حرام کاری (adultry) میں عورت ہی کو بڑا مجرم گرداننا چاہئے اور یہ کہ اس کی رضامندی کے بغیر یہ عمل ناممکن ہوتا ہے۔ (قرآن نے جرم کی مذمت کرتے ہوئے زانیہ کو سزا پہلے اور زانی کو بعد میں رکھا ہے 24:2)

شیخ احمد سرہندی، مکتوبات امام ربانی جلد اول، مکتوب نمبر 192۔ نول کشور ایڈیشن، تاریخ اشاعت ندارد لکھنو اول، صفحات 91-190)

بادشاہ جہانگیر (1605-1627)

مغل بادشاہ جہانگیر سے منسوب اخلاقی مواعظ کا نسخہ درج ذیل ہدایات پر مبنی ہے: "بیٹیوں کی موت پر آزردہ مت ہو، عورتوں کی نصیحت پر عمل نہ کرو، ان کی دلجوئی نہ کرو، ان کے فریب، اور چالبازی سے کبھی غافل نہ ہو" (پند نامہ جہانگیری، خواجہ نعمت اللہ الحراوی کی کتاب کا ضمیمہ، ڈھاکہ 1962، صفحہ 703) اگرچہ اس طرح کے نصائح خود جہانگیر کی اپنی یادداشتوں میں نہیں پائے جاتے۔

عورت اگر کمزور اور جاہل گردانی گئی تو یہ فطرت کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ یہ مرد کا استبداد تھا۔ اگر عورت کو تعلیم کی ہر سہولت سے محروم رکھا جائے اور پھر توقع کی جائے کہ وہ علم و ادب میں مناسب اضافہ کرے تو یہ سراسر ظلم ہے۔ ہندوستان میں 1891 کی مردم شماری کے مطابق ہر 23 تعلیم یافتہ مردوں کے مقابلے میں ایک عورت خواندہ تھی۔

قارئین عالم اسلام کے ان دیوقامت سکالرز کے خیالات کا آپ نے موازنہ اور قدرے جائزہ دیکھ لیا۔ غزالی کے خیالات اسلامی دنیا میں زیادہ

مقبول ہوئے مگر ابن رشد کے خیالات کو کسی نے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ہاں یورپ والوں نے اس کی اہمیت کو سمجھا اور تسلیم کر کے ان کو اپنانا شروع کر دیا۔ اسلامی دنیا میں آج عورتوں کی حالت پر آٹھ آٹھ آنسو بہانے کو جی کرتا ہے۔ عراق میں داعش کے داعی جس قدر بھیانک طریق سے شیعہ اور یزیدی عورتوں سے وحشیانہ جنسی سلوک کر رہے ہیں انسان کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ جی کرتا ہے زمین پھٹ جائے اور انسان اس کے اندر گر جائے۔ اسلامی دنیا میں عورت کا بطور انسان کوئی تشخص نہیں اسکا جسم، اس کی روح اور خیالات اس کے اپنے نہیں بلکہ وہ اس کے باپ، بھائی، خاوند یا دیگر مرد رشتہ داروں کے ہوتے ہیں۔ وہ گھر سے باہر اکیلے نہیں جا سکتی، اپنی مرضی سے ولی کی رضا کے بغیر شادی کیلئے رضامندی کا اظہار نہیں کر سکتی، جائیداد میں اس کا حصہ بیٹوں کے برابر کا نہیں ہوتا، اسلامی ممالک میں عورت کی شہادت نصف مگر مغربی ممالک میں اس کی شہادت مرد کے مساوی ہوتی۔ اگر کسی شخص کی صرف ایک ہی بیٹی ہو تب دوسرے مرد رشتہ دار وراثت میں حصہ لینے آ جاتے ہیں۔

ان میں سے کئی ناانصافیوں کا تعلق کلچر سے ہے مذہب سے نہیں۔
دیکھا جائے تو ہر معاشرے میں عورت کیساتھ غیر منصفانہ سلوک ہی کیا جاتا رہا ہے۔ ماں کی تو بہت عزت کی جاتی مگر بطور بیوی کے اس پر تمام ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔ نوجواں عورت جب مسجد جاتی تو اس کا وکیل یا ولی اس کی طرف سے نکاح کی رضامندی کا اظہار منظور ہے کہہ کر کرتا ہے لیکن جب یہی نوجوان عورت ڈاکٹر، ٹیچر، نرس، یا پائلٹ یا پولیس آفیسر بن جاتی تو وہ اپنی مرضی سے کام کرتی اور اپنی لیاقت کا لوہا منواتی ہے۔ ہاں مسجد میں وہ اس لائق نہیں کہ حاضرین کے سامنے بلند آواز میں منظور ہے کہہ سکے۔

کاش کہ ہم نے اسلامی دنیا میں ابن رشد کے خیالات اور نظریات کو زیادہ وقعت دی ہوتی تو ہم بھی فخر سے کہہ سکتے کہ ہماری عورتیں بھی خلاء کی تسخیر میں حصہ لے رہی ہیں، ان میں سائنسدان ہیں، ان میں پائلٹ ہیں، ان میں تمام قسم کی صلاحتیں موجود ہیں۔ ان میں وہ تمام روحانی اور دانشی صلاحتیں ہیں جو تمام انسانوں میں پائی جاتی ہیں۔

کتابیات
۱۔ سوانح ابن رشد، زکریا ورک، پبلشر شعیب عادل، نیا زمانہ پبلی کیشنز لاہور۔
۲۔ امام محمد غزالی، نصیحته الملوك، تہران
۳۔ نادیہ ہرہراش Nadia Harhash انٹرنیٹ پر مضمون "ابن رشد ویوز آن ویمن"۔
۴۔ برصغیر میں تاریخ کا سفر، ترجمہ ڈاکٹر انور شاہین، فکشن ہاؤس لاہور ۲۰۱۴ مضمون۔ قرون وسطیٰ کی صنفی تاریخ کی تلاش عرفان حبیب ●●

ششماہی ریسرچ اور ریفریڈ جرنل

ادب وثقافت

سرپرست اعلیٰ

ڈاکٹر محمد اسلم پرویز

مدیر

پروفیسر محمد ظفرالدین

ناشر: ڈائرکٹوریٹ آف ٹرانسلیشن اینڈ پبلیکیشنز
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
گچی باؤلی، حیدرآباد ۵۰۰۰۳۲ (تلنگانہ)
9347690095
adabosaqafatmannu@gmail.com

وہ دکھ بھرا دن

دیپک بدکی

وہ امتحان ہال میں سوالات پر نظر دوڑا رہی تھی۔ اردو لنگویج کا امتحان تھا اور مضمون لکھنا ضروری تھا۔ کئی موضوعات دیے گئے تھے مگر ایک موضوع نے اسے چونکا دیا۔ 'میری زندگی کا سب سے المناک دن'۔

وہ سوچ میں پڑ گئی اور اس کو وہ دن یاد آیا جب وہ زندگی سے پوری طرح مایوس ہونے پر مجبور ہو گئی۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آ رہی تھی۔ کہیں سے کوئی امید کی کرن دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ہمت کر کے اس نے قلم کو جنبش دی اور اپنی زندگی میں گزرا حقیقی حادثہ رقم کرنے لگی۔

اکلوتی بیٹی ہونے کے باوجود والدین نے مجھے مسوری انٹرنیشنل سکول میں داخلہ کروایا تاکہ میری تعلیم میں کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ لڑکیوں کا بورڈنگ سکول تھا اور ہوسٹل کے انتظامات بہت اچھے تھے۔ میرے والدین دہلی میں نوکری کرتے تھے۔ دن رات محنت کرتے، خود روکھی سوکھی کھاتے مگر ہر دم یہی خواب دیکھتے کہ ہماری بیٹی بہت بڑی سِوِل سرونٹ یا بزنس منیجر بن جائے۔ اب آپ میرا نام بھی پوچھیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کو میرا نام جاننے کا تجسس ہوگا۔ اس لیے اپنا نام بتلاتی چلوں۔ میرا نام ہے شفالی سنہا۔ پتا جی بنک میں ملازم ہیں اور ماں ایک پبلک سکول میں پی جی ٹی ہیں یعنی پوسٹ گریجویٹ ٹیچر۔

سچ تو یہ ہے کہ متوسط طبقے کے لوگ مستقبل کے لیے اپنے حال کو گروی رکھتے ہیں۔ ہوسٹل میں مجھے والدین کا پیار نہیں ملتا تھا اور دوسری جانب انھیں بیٹی کا سکھ نہیں ملتا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ ایک ہی بچے کے بعد انھوں نے خاندانی منصوبہ بندی کی تھی۔ کرتے بھی کیا، آج کل بچوں کی تعلیم صرف سرمائے کا کھیل بن چکا ہے۔ سال میں انھیں دو چار روز کی چھٹی مل جاتی تو فوراً مجھ سے ملنے چلے آتے یا پھر جب کرسمس یا پوجا کی چھٹیاں ہوتیں تو میں خود ہی بھاگ کر گھر پہنچ جاتی۔ ان دنوں ان سے پورے سال کا پیار حاصل کرنے کی کوشش کرتی۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی میرے والدین نے ایل ٹی سی لے کر کولکتہ گھومنے کا پروگرام بنا لیا۔ مجھے بھی لے کر جانا چاہتے تھے مگر میں نے منع کر لیا کیونکہ میں اپنی کلاسز ناغہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ گذشتہ بلاک کی ایل ٹی سی کی میعاد ختم ہونے والی تھی اور اگر وہ نہ جاتے تو یہ سہولت بعد میں نہیں مل سکتی تھی۔ سو وہ مجھ سے ملنے مسوری چلے آئے اور پھر ڈیرہ دون سے ریل گاڑی میں کولکتہ چلے گئے۔ واپسی بذریعہ ہوائی جہاز مقرر تھی جس کے لیے انھیں کچھ رقم اپنی جیب سے خرچ کرنا پڑی۔ کولکتہ سے وہ مجھ سے ٹیلی فون پر باتیں کرتے اور وہاں کے مندروں اور رسم و رواج کے بارے میں بتلاتے۔ ہفتہ بھر کولکتہ میں ان کا قیام رہا۔

۲۰؍فروری کو انھیں واپس دہلی پہنچنا تھا۔ اسی روز ٹیلی ویژن پر خبر آئی کہ کولکتہ سے آ رہا ہوائی جہاز راستے میں ہائی جیک کر لیا گیا ہے۔ میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگی کہ اس فلائٹ میں میرے والدین نہ ہوں۔ لیکن جلدی ہی اپنی خود غرضی اور حماقت پر ندامت ہوئی۔ سوچنے لگی اگر میرے والدین نہیں ہوں گے کسی اور کے تو ہوں گے۔ تخریب تو تخریب ہے۔ نہ جانے ان انسان نما درندوں کو ایسی حرکتیں کرنے سے کیا ملتا ہے! میں بہت پریشان ہوئی۔ ہوسٹل وارڈن سے بات کر لی اور اس نے دن بھر ٹیلی ویژن چالو رکھنے کی اجازت دی۔ سوچ رہی تھی کہ کہیں سے کوئی خبر مل جائے کہ ہوائی جہاز پر کون لوگ سوار تھے۔ اِدھر عجیب عجیب سے ڈراونے سپنے آتے رہے۔ میرے ذہن پر والدین کے اُداس اور لاچار چہرے بار بار ابھر رہے تھے اور مجھے پکار رہے تھے۔ میری آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا اور میں خاموش ٹیلی ویژن کی ہر خبر دیکھتی رہی۔

ہوائی جہاز میں دو سو سے زائد مسافر سوار تھے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ معصوم لوگوں کو یرغمال بنانے سے ان اغوا کرنے والوں کو کیا ملتا ہے؟ دل سے بد دعائیں نکل رہی تھیں۔ انسان کی تخریبی کارروائیوں پر تعجب ہو رہا تھا۔ خود کو اشرف المخلوقات کہنے والا انسان جب تخریب پر اُتر آتا ہے تو حیوانیت کی ساری حدیں پار کر جاتا ہے۔

کولکتہ سے دہلی کا سفر دو ڈھائی گھنٹے کا تھا۔ سفر کے دوران ہوائی جہاز میں تین آدمی کھڑے ہوئے، انھوں نے اپنے پستول نکالے اور ائیر ہوسٹس کو یرغمال بنا کر کاک پِٹ میں داخلہ حاصل کر لیا۔ انھوں نے پائیلٹ کو جہاز دہلی کے بدلے لاہور لے جانے کا حکم دیا۔

ٹیلی ویژن پر مسلسل اَپ ڈیٹ آ رہے تھے۔ طیارے نے اپنا روٹ بدل لیا اور لاہور کی طرف اڑان بھر لی۔

میرے لیے تو ہر لمحہ اذیت ناک بنتا جا رہا تھا۔ والدین کے بارے میں کہیں سے کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ ان کا موبائل بھی سوئچ آف آ رہا تھا۔ کولکتہ میں کسی سے جانکاری نہیں تھی جس سے رابطہ کیا جاتا۔ وارڈن نے بہت کوشش کی کہ انڈین ائیر لائنز سے رابطہ کر لے مگر ناکام رہی۔ وہاں کے سبھی ٹیلی فون انگیج مل رہے تھے۔

میں مسلسل ٹیلی ویژن کی تازہ خبریں دیکھ رہی تھی اور اس انتظار میں تھی کہ کب وہ مسافروں کے نام بتا دیں۔ تین گھنٹے اسی تذبذب میں گزر گئے۔ میری آنکھیں پُر آب ہو رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ میں اپنے ماں باپ کا منہ

دوبارہ نہیں دیکھ پاؤں گی۔ عجیب سے ڈراونے خیالات ذہن میں پیدا ہورہے تھے۔ اگر میرے والدین واپس نہ آئے تو میرا کیا ہوگا؟ میں یتیم ہوجاؤں گی۔ میری تعلیم بند ہوجائے گی۔ اور پھر میرے ماں باپ کے سپنے سب دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ کتنی بے ثبات ہے یہ زندگی! مڈل کلاس سوسائٹی کی یہی دشواریاں ہیں۔ ایک معمولی سی کروٹ سے تلپٹ ہوجاتی ہے۔ میں تو کہیں کی نہیں رہ جاؤں گی۔

سہیلیاں میرے آگے پیچھے جمع ہوتی چلی گئیں اور مجھے دلاسہ دیتی رہیں۔

”شفالی، مجھے معلوم ہے کہ اس وقت تم پر کیا گزرتی ہوگی۔ مگر میری التجا ہے کہ بی پوزیٹیو۔ منفی خیالات کو ذہن سے نکال دو۔ آپ کے ماتا پتا ٹھیک ہوں گے اور جلدی گھر پہنچ جائیں گے۔“

”شفالی، ہم اس دکھ کی گھڑی میں تمھارے ساتھ ہیں اور بھگوان سے پرارتھنا کرتے ہیں کہ تمھارے والدین صحیح سلامت واپس گھر پہنچ جائیں۔“

میں ان کی باتوں پر دھیان نہیں دے رہی تھی۔ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔ قبل از دوپہر ہی ایسی منحوس خبر سننے کو ملی تھی۔ لنچ کیا کرتی ایک نوالہ بھی گلے سے نیچے نہیں اترتا تھا۔ بھوک غائب ہوگئی تھی۔ لاکھ کوشش کرنے کے باوجود آنسو روکنے سے بھی نہیں رک رہے تھے۔

نہ جانے ڈیڈی کس حال میں ہوں گے؟ وہ تو کبھی کسی کا برا نہیں چاہتے ہیں پھر ان پر یہ مصیبت کیوں آن پڑی۔

ممی بے چاری کا تو دل کمزور ہے۔ نہ جانے کیا بیت رہی ہوگی اس پر۔

پھر خیال آتا کاش وہ اس فلائٹ میں نہ ہوں۔

پھر خبر آئی کہ طیارہ تیل بھرنے کے لیے امرتسر میں اتارا گیا۔ اغوا کرنے والوں نے بہت کوشش کی کہ وہ امرتسر میں نہ اترے مگر پائیلٹ نے اپنا فیول گیج دکھا کر انہیں بتایا کہ طیارہ آگے اور نہیں بڑھ سکتا ہے۔ سرکار کی طرف سے بہت کوشش کی گئی کہ ہائی جیکروں کو کسی طرح بہلایا پھسلایا جائے اور یرغمال شدہ لوگوں کو آزاد کرایا جائے۔ مگر اغوا کرنے والے تو کچھ بھی ماننے کو تیار نہ تھے اور کسی بھی کارروائی پر طیارے کو بم سے اڑانے کی دھمکی دے رہے تھے۔

ٹیلی ویژن پر یہ خبریں مسلسل دکھائی جارہی تھیں۔ ”امرتسر کے ائیر پورٹ پر ہوائی جہاز اترا ہوا ہے، اس کو فوج نے گھیر لیا ہے مگر کوئی آگے بڑھنے کی جرأت نہیں کررہا ہے۔“

اس طرح دن کا ڈیڑھ بج گیا۔

پھر دو بج گئے۔

اور پھر تین بج گئے۔

دریں اثنا اغوا کرنے والوں نے وائرلیس پر خبر دی کہ ہوائی جہاز کو اسی صورت میں آزاد کیا جائے گا جب تین چنندہ دہشت گردوں کو حفاظت کے ساتھ ہمارے حوالے کیا جائے گا اور ہمیں اپنی مرضی سے جانے کی اجازت دی جائے گی۔

متعلقہ افسروں نے ہوم منسٹری سے رابطہ کیا اور ان کو اغوا کرنے والوں کے مطالبات سے آگاہ کرلیا۔

سرکار مجبور تھی۔ ایک طرف تین دہشت گرد تھے اور دوسری طرف دو سو سے زائد مسافر اور ہوائی جہاز کا عملہ۔ سرکار نے ان کی یہ مانگ مان لی مگر دہشت گردوں کو لے کر آنے میں تو وقت درکار تھا۔ جو کچھ بھی ہوتا دوسرے دن ہی ممکن تھا۔

رات بھر معاملہ یوں ہی لٹکا رہا۔ مسافر رات بھر ہوائی جہاز میں قید رہے۔ بچے، نوجوان، بوڑھے، عورت، مرد... سبھی رات بھر جاگتے رہے اور اپنے مستقبل کے لیے فکرمند رہے۔ شکر تھا کہ کوئی انہونی نہیں ہوئی۔

کہیں سے کوئی خبر نہیں مل رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ گھڑی کی سوئیاں ایک ہی جگہ تھم گئی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر وہی باسی خبریں پروسی جارہی تھیں۔ جی میں آئی کہ ٹیلی ویژن ہی توڑ دوں۔ میرے والدین یرغمال ہو چکے تھے مگر ٹیلی ویژن والے ہوائی جہاز کے اردگرد کے مناظر دکھا رہے تھے۔

بیچ بیچ میں ہائی جیکروں کو یوں لگا کہ ان کی مانگوں پر کوئی کارروائی نہیں ہو رہی ہے، انھوں نے ایک ایک کر کے پسنجروں کو مارنے کی دھمکی دی۔ مگر انھیں دلاسہ دیا گیا کہ ان کے لیے معقول انتظامات کیے جارہے ہیں۔ ایک الگ جہاز جس میں وہ تینوں دہشت گردوں سمیت سرحد پار کرسکتے ہیں۔

اور پھر دوسرے روز ایسا ہی ہوا۔ قریب بارہ بجے ایک اور طیارے کا انتظام کیا گیا، جس میں تینوں مطلوبہ دہشت گرد تھے، وہ امرتسر ائیر پورٹ پر اترا، ہائی جیکروں کو بھی اسی طیارے میں منتقل کیا گیا اور وہ طیارہ پڑوسی ملک کے لیے روانہ کردیا گیا۔

مسافر بے تحاشہ ہوائی جہاز سے باہر آنے لگے گویا قید خانے سے قیدی چھوٹ گئے ہوں۔ انھیں بھروسہ ہی نہیں ہورہا تھا کہ وہ زندہ ہیں اور آزادی سے اپنے ملک میں سانس لے رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد ٹیلی ویژن پر مسافروں کے نام بتائے گئے۔ پتاجی اور ممی کا نام بھی ان میں شامل تھا۔

مجھے گو اطمینان ہوا کہ میرے والدین زندہ ہیں لیکن پھر بھی بے کلی و بے چینی سی تھی۔ میں ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی، ان سے باتیں کرنا چاہتی تھی، اپنی ماں کا لمس محسوس کرنا چاہتی تھی۔ رات کے وقت ٹیلی فون پر دونوں سے بات ہوئی مگر پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔ دوسرے روز علی الصباح میں دہلی کے لیے روانہ ہوگئی۔ گھر کے دروازے پر ماں باپ دونوں کو منتظر پایا۔ انھوں نے مجھے بھینچ کر گلے لگایا اور زار و قطار رونے لگے۔ مجھے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ میں انھیں دیکھ رہی ہوں۔

آج بھی جب کبھی مجھے اس المناک دن کی یاد آتی ہے تو رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ ●●

اسماء حسن: ھانگ کانگ میں اردو کی بلند آواز

مہوش نور

اسماء حسن کا تعلق پاکستان کی راجدھانی اور مشہور ومعروف شہر اسلام آباد سے ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے اردو ادب میں پوسٹ گریجویشن میں ضلعی سطح پر پہلی پوزیشن حاصل کرنے پر انہیں گولڈ میڈل سے سرفراز کیا گیا تھا۔ بعد ازاں اپنے تعلیمی سلسلے کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ایم فل میں ''اقبالیات'' پر تحقیقی کام شروع کیا۔ لیکن ہانگ کانگ میں مستقل طور پر منتقلی کے بعد نا مساعد حالات کی وجہ سے تعلیمی سلسلے کو بیچ راہ میں ہی منقطع کرنا پڑا ۔ لیکن عنقریب اپنے اس ادھورے کام کو مکمل کرنے کی خواہشمند ہیں۔ اس دوران آپ کا تحقیقی کام بدستور جاری ہے۔ اسماء حسن نے پاکستان کی ایک ایسی شخصیت اور مشہور ومقبول شاعر سید شہزاد حسن ظاہر پر تحقیقی مقالہ لکھا جن پر اس سے پہلے کسی بھی اہل قلم کی تحریر منظر عام پر نہیں آئی تھی ۔ اس مقالے میں شاعر کی شخصیت اور فن پر بڑے مدلل اور مفصل انداز میں بحث کی گئی ہے۔ موصوفہ کا یہ مقالہ ''سید شہزاد حسن ظاہر: حیات وفن'' کے نام سے کتابی شکل میں بھی شائع ہو چکا ہے اور پنجاب یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہے۔ ان کی یہ تحقیق اس اعتبار سے بھی کافی اہمیت کی حامل ہے کہ یہ مقالہ نہ صرف اردو ادب میں نئی نسل اور ریسرچ اسکالرس کے لیے بہترین حوالہ ثابت ہوگا بلکہ پاکستان کے معروف شاعر سید شہزاد حسن ظاہر پر مزید تحقیقی کام آگے بڑھانے میں کافی مددگار ثابت ہوگا۔

اسماء حسن میں تحقیق کے ساتھ ساتھ تنقیدی شعور وصلاحیت بھی ہے اس لیے وہ ایک لمبے عرصے تک تحقیقی وتنقیدی مضامین لکھتی رہیں، منفرد انداز میں لکھے گئے تحقیقی اور تنقیدی مضامین نے حلقہ احباب میں ان کی اپنی ایک الگ پہچان بنائی۔ ادبی اور تحقیقی کام کے علاوہ سوشل میڈیا پر بھی مختلف ادبی فورمز اور آن لائن جرائد میں اپنے تنقیدی اور تجزیاتی مضامین کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز رہی ہیں۔

اسماء حسن بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ اسماء کی طبیعت اردو ادب کی مشہور ومقبول صنف افسانہ نگاری کی طرف بچپن سے ہی مائل تھی وہ کہانیاں لکھتیں اور اسے ڈائری میں محفوظ کر لیتیں لیکن ترک وطن کے بعد اسماء حسن نے افسانہ نگاری کو مستقل طور پر اپنا لیا اور نہ صرف اپنایا بلکہ بہترین افسانے بھی تخلیق کیے۔ موصوفہ عام طور پر علامتی اور تجریدی افسانے لکھتی ہیں۔ حساس طبیعت کی مالک اسماء حسن ہمیشہ آفاقی اور حساس موضوعات پر قلم اٹھاتی ہیں، چاہے وہ کراہتی یا شرمسار ہوتی انسانیت ہو یا ظالم حکمرانوں کی سفاکیت ہو یا پھر عشق کی پامالی کی داستان ہو ہر موضوع پر ان کا قلم کاغذ پر جذبات واحساسات بکھیرنے لگتا ہے۔

اسماء حسن کی تخلیقات اب تک ہندوپاک کے مختلف ومعتبر ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہو چکی ہیں۔ بہار اردو اکادمی (انڈیا) کے ماہنامہ ''زبان وادب'' میں متعدد تخلیقات شائع ہوئیں۔ اسی رسالے کے لیے ادارتی نوٹ بھی لکھنے کا موقع ملا۔ اس کے علاوہ ماہنامہ ''گلشن خواتین'' (مالیگاؤں، انڈیا)، ''دربھنگہ ٹائمز'' (دربھنگہ، انڈیا)، ''جرس'' (پاکستان)، مختلف آن لائن رسالوں میں متعدد افسانے، تحقیقی وتنقیدی مضامین ومقالات اور مائکرو فکشن شائع ہو چکے ہیں۔ اسماء حسن چونکہ تحقیق اور تنقید کی طالبہ ہیں اس لیے ان کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں اور بہت جلد ان کا ایک افسانوی مجموعہ، ایک ناول اور تحقیقی وتنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب منظر عام پر آنے والی ہے۔ اسماء حسن کی اردو خدمات اور بہترین کاوش کے لیے مبارکبا اور نیک خواہشات۔

موجودہ ظالم و جابر سیاسی نظام کا آئینہ اسماء حسن کے ''شہر بتاں'' افسانے میں ایک ایسے ملک کو موضوع بنایا گیا ہے جہاں کے ظالم حکمراں کے حکم کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ یعنی اس ملک کے ایک ایک باشندے کی سانسوں پر ان کی حکومت ہے۔ اپنی طاقت کے غرور میں یہ ظالم حکمراں انسانیت بھول چکے ہیں اور لوگوں کو اپنا غلام بنا کر ان پر طرح طرح کے ظلم و جبر کرتے ہیں اور جب کوئی ان کے خلاف آواز اٹھاتا ہے یا کوئی سوال کرتا ہے تو ان کو غلام یا قیدی بنا کر ان کے ہونٹوں کو کچھ اس طرح سل دیا جاتا ہے کہ وہ کچھ بول ہی نہ سکیں۔ لیکن جب اتنے ظلم و جبر کے باوجود یہ آواز کو دبانے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو ان آوازوں کو وہ ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ نہیں معلوم کہ انقلاب کی یہ آواز اتنی بلند ہوتی ہے کہ یہ جتنا دبائی جاتی ہے اتنی ہی زیادہ بلند ہوتی جاتی ہے جیسا کہ اس افسانے میں دکھایا گیا ہے۔

''شہر بتاں'' افسانہ ایک علامتی افسانہ ہے اور علامتوں کے ذریعہ ہی ایک ظالم سامراج کی عکاسی کی گئی ہے۔ افسانہ کافی دلچسپ ہے۔ افسانے کا آغاز ہی قاری کو تجسس میں ڈال دیتا ہے کہ آخر یہ کون لوگ ہیں جن پر اتنے ظلم ڈھائے گئے ہیں کہ ان کے متحرک جسم کو ایک زندہ لاش میں تبدیل کر دیا گیا۔ وہ کون سا ظلم ہے جس کے ڈھائے جانے پر لوگوں کی چیخیں اتنی دردناک اور دل خراش ہیں کہ لوگ اپنی قوت سماعت سے محروم ہونے کی دعا کرنے لگتے ہیں، قصور کیا تھا؟ جن کی پاداش میں ان کا ہاتھ کاٹ کر اور سیسہ پگھلا کر ان کی آنکھوں میں ڈالا جا رہا تھا۔ افسانہ اتنا دلچسپ ہے کہ پورا افسانہ نقل کرنے کا دل کر رہا ہے لیکن یہاں افسانے کے آغاز کا اقتباس پیش خدمت ہے جس سے قاری متاثر ہو کر ایک ہی نشست میں افسانہ پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے:

''خوابیدہ محل کے وہ لوگ جن کے ہونٹوں کو موٹی سوئی اور دھاگہ

DEPT. OF URDU ,JNU NEW DELHI
mahwashjnu10@gmail.com

لے کرسی دیا گیا تھا، جہاں زر خرید روحیں قید بامشقت کاٹ رہی تھیں اور فرمانرواؤں کے پاؤں تلے دھرتی ماں بھی کانپ رہی تھی۔ وہ وہاں پہونچے تھے تو زندہ لاشیں ادھر اُدھر گھوم رہی تھیں، ڈرے سہمے اور مٹی میں اٹے چہروں نے جب انہیں دیکھا تو بھاگتے ہوئے، کسی نہ کسی اوٹ میں پناہ لینے لگے۔ نہ تو کسی نے ان پر پتھر اچھالے اور نہ ہی ان کے متحرک چست قدموں کو زنجیر پہنائی گئی وہ آگے بڑھتے رہے تو زندہ لاشیں پیچھے ہٹتی رہیں، ان کے سرخ وسفید چہروں پر کسی مہیب پرچھائی کا بسیرا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ان 'بائیس' (22) نے کچھ دور پہونچ کر ایک خاص مقام پر خیمے گاڑنے شروع کردیئے تھے۔ کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ ان کی دھرتی ماں پر قدم رکھنے کی لغزش میں کوئی ان سے جرأت استفسار کرتا، وہ کیلوں پر ضرب لگاتے ہوئے خیمے گاڑتے چلے جا رہے تھے، زوردار آوازیں لوگوں کے کانوں تک پہنچتیں تو وہ اپنی قوت سماعت سے محروم ہونے کی دعا کرنے لگتے، ان کے لیے اس سے زیادہ مناسب جگہ اور کوئی نہ تھی، جہاں سب کے ہونٹوں کے پیچھے قفل ابجد کا سارا راز پوشیدہ تھا، جن کے ہاتھ کٹے ہوئے تھے اور سیسہ پگھلا کر ان کی آنکھوں میں ڈال دیا گیا تھا، ایسی زندہ لاشیں دیکھ کر وہ مطمئن ہو چلے تھے کہ وہ بالکل صحیح مقام پر ڈیرے ڈالنے والے ہیں۔''

یہ افسانہ سامراج طاقتور کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ اس کہانی میں افسانہ نگار نے ظلم وستم کی داستان بہت خوب صورتی کے ساتھ پیش کی ہے۔ ''شہر بتاں'' نام ہی اپنے آپ میں دل جیتنے والا نام ہے۔ جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکی ہوں کہ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ اس افسانہ میں بت خاموشی، تاریکی، گونگے، بہرے اور اندھے پن کی علامت ہے۔ انہیں علامتوں سے افسانہ نگار نے اپنی کہانی کا تانا بانا بنا ہے۔ ایک عجیب وغریب بستی جہاں بے حس انسان بغیر چوں چراں اپنی زندگی بسر کرنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ اس عافیت کے پیچھے بھی ایک دردناک داستان ہے۔ اس دردناک داستان میں ظالم نظام اور وحشی صفت انسان یا یوں کہہ لیں کہ ظالم وجابر سیاسی نظام نے ان قبائل پر ظلم وستم کی انتہا کر دی تھی۔ اسی دوران بائیس افراد کی تعداد نے اس بستی میں قیام کرنے کی غرض سے پڑاؤ ڈالا۔ یہ بائیس افراد ایک طرح سے نئے حوصلے کی شکل میں سامنے آئے۔ جن کے حوصلے کی وجہ سے مقفل ہونٹوں میں ہلکی ہلکی جنبش ہونے لگی اور انقلاب کی کرنیں آہستہ آہستہ زندہ لاشوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر رہی تھی۔ مگر خوف کا ناگ اب بھی ان کے دلوں میں پھن پھیلائے بیٹھا تھا۔ افسانہ نگار مزید لکھتی ہیں:

''آفتاب کی کرنیں چہار سو پھیل رہی تھیں اور زندہ لاشوں پر مسکراہٹ پھیلا رہی تھیں مگر وہ لوگ زندان خانے کے ایسے مقید تھے، جنہیں صدیوں بعد سورج کی رفاقت کا موقع ملے تو وہ اس کی تمازت اور حدت کو برداشت نہ کر پائیں۔ کوئے بتاں کے وہ مکین پہلے سے بھی زیادہ سہم گئے اور اپنے بچوں کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر کسی نہ کسی اوٹ میں پناہ لینے لگے، شاید وہ پھر سے جذبات فروشی کا سودا ہوتا دیکھنا نہیں چاہتے تھے، وہ انسانیت سوز زندگی کے پھر سے متحمل نہیں ہو سکتے تھے، جہاں زندہ انسانوں کی کھالیں کھینچوا دی جاتی ہیں، جہاں حق بات کہنے کا خراج متخرفہ نہ جانے کتنی دہائیوں تک ادا کرنا پڑتا ہے۔''

لیکن جب انقلاب کے لیے ایک بار آواز اٹھائی جاتی ہے تو وہ آواز تھمنے کے بجائے بلند اور تیز ہوتی جاتی ہے چاہے اس کے لیے جان کی قربانی ہی کیوں نہ دینی پڑے۔ اسما حسن کے اس افسانے کے اختتامیہ حصے میں حبیب جالب کی نظم ''اٹھو مرنے کا حق استعمال کرو'' بالکل صادق نظر آتا ہے:

جینے کا حق سامراج نے چھین لیا
اٹھو مرنے کا حق استعمال کرو
ذلت کے جینے سے مرنا بہتر ہے
مٹ جاؤ یا قصر ستم پامال کرو

شہر بتاں کے افراد نے اب دھیرے دھیرے ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ یعنی اب ان کے اندر بیداری پیدا ہونے لگی تھی۔ بولنے کی کوشش میں ان کے ہونٹوں کی سلائی ادھڑنے لگی تھی۔ اب انہیں مزید ذلت و رسوائی اور ظالم سامراج کے سامنے سر جھکانے والی زندگی برداشت نہیں تھی۔ اور اب اس شہر کی ہر ایک گلی اور کوچوں سے لوگ ہتھیلی پر اپنی جان کو لے کر بے خوف قصر ستم کو پامال کرنے نکل پڑے تھے۔ افسانہ نگار لکھتی ہیں:

''وہ سب لوگ اس 'لڑکے' کی طرف مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے، مگر وہ دبک کر بیٹھا رہا، کچھ بینا و دانا نے اس کے ہونٹوں کی ادھڑی سلائی دیکھ لی تھی! اسی اثنا میں دور کہیں سے ایک آواز سنائی دی۔

''میں گواہی دیتا ہوں۔''

اور ساتھ ہی آواز دم توڑ گئی، یہ سنتے ہی اس 'لڑکے' کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی، اس نے ہونٹوں کی سلائی کو پکڑ کر کچھ یوں ادھیڑا جیسے اس کے سامنے اس کے 'ابی' کی کھال کو کھینچ کر اتار دیا گیا تھا۔ ڈرے سہمے ہوئے شہر بتاں والے محو حیرت تھے، سکتہ کسی بھوت پریت کی طرح سایہ فگن تھا۔ اس 'لڑکے' نے گھر کی دہلیز سے باہر ننگے پاؤں قدم رکھ دیا تھا۔ وہ اس سمت بھاگنے لگا جہاں سے 'میں گواہی دیتا ہوں' کی آوازیں مسلسل آ رہی تھیں اور دم توڑتی چلی جا رہی تھیں، بائیسویں گواہی کے دم توڑتے توڑتے وہ 'لڑکا' وہاں پہونچ چکا تھا، ظالم سامراج قہقہے لگاتے ہوئے اپنی فتح کا جشن منا رہے تھے، وہ سمجھ رہے تھے کہ شاید اب کوئی گواہی باقی نہ رہی ہو، مگر انہیں کیا معلوم کہ تیئسویں گواہی ابھی باقی تھی۔ فضا میں پھر سے ایک زوردار آواز گونجی تھی۔

''میں گواہی دیتا ہوں''۔ نشانہ باندھنے والوں نے دیوانہ وار نشانے لگانے شروع کیے مگر کوئی نشانہ اپنی سمت متعین نہ کر سکا۔ کیوں کہ آواز اب چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھی۔''

اس کہانی میں قرآن پاک کا ایک واقعہ یعنی سورہ کہف کی طرف بھی اشارہ ہے۔ اصحاب کہف ایک ظالم وجابر حکمراں کے خوف سے ایک غار میں پناہ لیتے ہیں اللہ پاک اصحاب کہف پر نیند طاری کر دیتا ہے۔ وہ تمام لوگ گہری نیند سو جاتے ہیں۔ جب ظالم حکمراں نیست و نابود ہو جاتا ہے تو اللہ پاک انہیں نیند سے بیدار کر دیتا ہے۔ اصحاب کہف تقریباً 309 برس سوتے رہے۔ ان کی تعداد کا تعین مشکل ہے اس کہانی میں بھی کہانی کار نے علامتی انداز اختیار کرتے

ہوئے ایک قوم کی عرض گزاشت بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کے علاوہ یہ کہانی ہراس ملک کی صورت حال کا احاطہ کرتی ہے جہاں ظالم وجابر حکمراں اپنے حق وانصاف کے لیے اٹھنے والی آواز کو خاموش کر دیتا ہے۔ یہاں کچھ ملک کو مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً ہانگ کانگ ،وہاں پر بھی عوام کو کھل کر اپنی رائے دینے کی آزادی نہیں ہے۔ ہنوستان بھی موجودہ دور میں جن ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں برباد ہو رہا ہے اور ساتھ ہی اس ظلم کے خلاف، حق اور انصاف کی آواز بلند کرنے والوں پر جس طرح کے مظالم کیے جارہے ہیں، ان کے ہونٹوں کو جس طرح مقفل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یہ کہانی ہندستان کی روح یعنی دستورِ ہند کی پامالی سے بھی مزین ہے۔ جہاں نہ لب کھولنے کی آزادی دی جارہی ہے اور نہ ہی ہندستانی اقلیت کو آرام وسکون میسر ہے۔سی۔اے۔اے، این۔آر۔سی، اور این۔پی۔آر کے قانون میں تبدیلی گویا دستورِ ہند کی روح کے منافی ہے۔ذات پات اور رنگ ونسل کی بنیاد پر شہریت کا تعین کسی بھی جمہوری ملک کے لیے عذاب سے کم نہیں ہے۔گویا سی۔اے۔اے ایک ایسا کالا قانون ہے جس کی وجہ سے ہندستان میں مقیم اقلیتی طبقوں کی شہریت مشکوک ہوسکتی ہے۔انہیں مشکوک قرار دے کر قید خانے میں ڈالا جاسکتا ہے۔حالاں کہ ہندستان کی تاریخ مسلمانوں کی قربانیوں کو کبھی فراموش نہیں کرسکتی ہے۔ہندستان میں مقیم اقلیتی طبقہ کے آبا و اجداد نے ہندستان کی آزادی کی لڑائی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ تقسیم ہند میں بھی مسلم قوم نے ہندستان ہی کو ترجیح دی تھی۔کچھ متعصب قسم کے افراد ملک کی گنگا جمنی تہذیب، قومی وملی یکجہتی اور جمہوری نظام کو توڑنا چاہتے ہیں۔اگر کوئی ان کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو اس کے ہونٹوں کو موٹی سوئی اور مضبوط دھاگے سے سیل کر قید خانے کے جان لیوا اندھیروں میں قید کر دیا جاتا ہے۔ اس تاریک اندھیرے میں نہ جانے کتنے معصوموں اور مظلوموں نے دم توڑ دیا مگر ظالم حکمراں کے دلوں پر ایک خراش تک نہ آئی۔ملک کی دیگر ریاستوں کی بہ نسبت جموں وکشمیر کی حالت بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔اسماء حسن کی اس کہانی میں کشمیر کو بھی دیکھ سکتے ہیں۔اسی پس منظر میں افغانستان، فلسطین، شام، یمن، لیبیا، چیچینا وغیرہ کو بھی دیکھا جاسکتا ہے جہاں نسل درنسل میزائل اور راکٹ سے ہلاک ہو رہے ہیں۔انسانی جانوں کی قیمت گویا کیڑے مکوڑوں سے بھی کم تر ہے۔انسانیت کی دہائی دینے والے ممالک سب سے زیادہ انسان اور انسانیت کا دشمن ہے۔ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام اپنی اصل طاقت کو پہچان کر اتحاد کا مظاہرہ کریں، کسی نہ کسی دن انقلاب کے ساتھ تبدیلی آئے گی۔اسماء حسن کا حالات حاضرہ پر ایک بہترین علامتی افسانہ ہے جس میں صدیوں کی دل خراش داستانیں روپوش ہیں۔ان عجیب وغریب اور انسانیت سوز داستانوں میں امید کی ایک کرن نے ظالم وجابر حکمراں کی ہڈیاں تک ہلا کر رکھ دی۔عوامی طاقت سب سے بڑی اور مضبوط طاقت ہوتی ہے۔اس لیے عوام الناس اس افسانے کی علامتی پہلو سے استفادہ کرتے ہوئے ظالم وجابر حکمراں کی خبر گیری کرسکتی ہے۔

اس کے علاوہ ’’سیاہ بختی‘‘، ’’شب یلدا‘‘ وغیرہ قابل ذکر افسانے ہیں۔جن میں مختلف اور نئے موضوعات کو پیش کیا گیا ہے۔کہانی کا پلاٹ عمدہ اور واقعات میں ربط قائم ہے۔ عام فہم، شستہ زبان اور خوبصورت انداز بیان میں لوگوں کی زندگی اور دلوں پر لگنے والے زخم، ان کے مسائل اور ان کی خوشیوں کو کہانی کے پیراہن میں ڈھال کر کچھ یوں لکھتی ہیں کہ قارئین ایک طویل وقفے تک کہانیوں میں کھویا رہ جاتا ہے۔ایک کامیاب کہانی کی یہی پہچان ہوتی ہے۔نئی بستیوں کے افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست ہیں جن میں اسماء حسن کی کہانیاں منفرد مقام حاصل کرنے میں بہت جلد کامیاب ہوں گی۔ ●●

مرگ انبوہ

ناول

مشرف عالم ذوقی

تیسری آنکھ

(شعری مجموعہ)

ڈاکٹر شریف احمد قریشی

7078709977

منٹو، غالب اور فدوی

آپ کے پسندیدہ افسانہ نگار کون ہیں؟ منٹو۔ اُن کا پورا نام کیا تھا؟ پورا نام تو یاد نہیں، بس منٹو منٹو کہتے ہیں۔ اچھا کوئی بات نہیں، اُن کے کچھ افسانوں کے نام بتایئے جو آپ نے پڑھے ہوں۔ افسانے تو بہت پڑھے ہیں، مگر اِس وقت بس ایک آدھ نام ہی یاد ہے، ایک تو سفید شلوار تھا۔ بیٹا سفید نہیں کالی شلوار تھا۔ اوہ سوری! مجھے بس شلوار یاد رہی، رنگ بھول گیا، ویسے بھی منٹو صاحب کہہ گئے ہیں کہ رنگوں میں کیا رکھا ہے۔ برخودار یہ بات منٹو نے کبھی نہیں کہی۔ ارے! نہیں کہی تو انہیں کہنی چاہیے تھی نا، اتنی اچھی لائن ہے، کسی بھی افسانے میں فِٹ کر دیتے۔ اور کوئی افسانہ یاد ہے منٹو کا؟ جی ہاں، رضائی، بہت دلچسپ افسانہ تھا۔ نوجوان اُس کا نام رضائی نہیں، لحاف تھا، اور وہ منٹو کا نہیں عصمت چغتائی کا افسانہ تھا۔ وہی وہی، جس کا بھی تھا، بہت مزے کا تھا۔

یہ اُس گفتگو کا مغز ہے جو ایک نوجوان سے کسی یونیورسٹی کی تقریب میں ہوئی تھی۔ نوجوان پر کیا بگڑتا، ہم خود لڑکپن میں منٹو کو ایسے ہی چسکے لے لے کر پڑھتے تھے۔ کچھ روز پہلے کتابوں کے طاقچے میں ''پورا منٹو'' کی تین جلدوں پر نظر پڑی تو ایک مرتبہ پھر ورق گردانی کی نیت سے اٹھا لی، منٹو کے افسانے تو اپنی جگہ شمس الحق عثمانی کا ''مقدمہ'' بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس میں انہوں نے بتایا ہے کہ کس عرق ریزی سے انہوں نے منٹو کے تمام افسانوں کو اکٹھا کیا اور صرف اُن افسانوں کے متن اٹھائے جو کتاب کی پہلی اشاعت یا پھر منٹو کی زندگی میں ہی کتاب کے آخری ایڈیشن میں شامل تھے، اُس کے بعد اُن نسخوں کو ترجیح دی جو منٹو کی وفات کے بعد صفیہ بیگم کی اجازت سے شائع ہوئے۔ اسی طرح کچھ افسانے ایسے بھی تھے جن میں منٹو نے بعد ازاں تبدیلیاں کیں، انہیں بھی ترمیم شدہ ایڈیشن کے مطابق بنیادی نسخے میں شامل کیا گیا ہے۔ اِس مقدمے کی سب سے دلچسپ بات منٹو کے افسانوں میں زبان کی غلطیاں ہیں جن کی نشاندہی کسی قدر ملفوف، لکھنوی اور شرمیلے انداز میں عثمانی صاحب نے کی ہے۔ 'متن کی تصحیح' کے نیچے انہوں نے اغلاط کی تین قسمیں بیان کی ہیں، واضح اغلاط، غیر واضح اغلاط اور تکرارِ لفظی۔ اِن تمام اغلاط کو عثمانی صاحب نے کمال شفقت سے بریکٹ کے اندر ڈال کے درست کر دیا ہے۔ مثلاً 'اُس کے جوابوں کے اس اختصار میں روکھا پن تھا' کو عثمانی صاحب نے 'اُس کے جواب کے اِس اختصار۔۔' کر دیا ہے۔ اسی طرح غیر واضح اغلاط میں کئی جگہ آپ نے منٹو کی تحریر کو 'درست' کیا ہے، مثلاً منٹو نے اگر پلڑا وزنی لکھا ہے تو اسے پلڑا بھاری کر دیا ہے، ایک جگہ 'ادھار' کو 'قرض' کر دیا ہے کہ بات کی مناسبت سے وہی موزوں تھا۔ منٹو کے افسانوں میں بکھری ایسی بے شمار اغلاط کو ٹھیک کر کے عثمانی صاحب نے متن کو گویا پاک تو کر دیا ہے مگر اِن تمام جگہوں پر احتیاطاً آگے پیچھے سوالیہ نشان بھی ڈال دیا ہے جیسے کہہ رہے ہوں کہ بھائی میں نے تبدیلی نہیں کی فقط سجھا دیا ہے۔ آکسفورڈ کی شائع شدہ اِس 'پورا منٹو' کے سرورق پر لکھا ہے 'تحقیق، تدوین، ترتیب۔ شمس الحق عثمانی'۔ میرے خیال میں یہ بھی ایک غلطی ہے، اسے درست کر کے لکھا جانا چاہیے 'تحقیق، تدوین، ترتیب، تصحیح۔ شمس الحق عثمانی'۔

سید علی حیدر نظم طبا طبائی کی شرح دیوان غالب بھی فدوی کے سرہانے دھری ہے۔ اللہ کو جان دینی ہے، یہ شرح اصل کلام سے زیادہ دقیق ہے۔ طبا طبائی نے جہاں غالب کے اشعار کی شرح کر کے معانی کے جہان دریافت کیے ہیں وہاں کئی جگھوں پر غالب کی گوشمالی بھی کی ہے اور بہت سے اشعار میں صرف ونحو اور محاورے کی لغزشوں پر غالب کی گرفت کی ہے، بقول ظفر احمد صدیقی ''ایسے مواقع پر ان کے طرزِ کلام کو دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ طبا طبائی ایک کہنہ مشق استاد ہیں اور غالب ایک تازہ واردِ بساطِ سخن''۔ آگے انہوں نے غالب کے اشعار کی مثالیں دی ہیں جن پر طبا طبائی کے تبصرے کچھ یوں ہیں: 'جگر تشنہ آزار تسلی نہ ہوا' میں 'جگر تسلی نہ ہوا خلاف محاورہ ہے'۔ ایک اور جگہ غالب کا مصرع ہے 'ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن' یہاں طبا طبائی نے محاورے کی غلطی پکڑتے ہوئے لکھا ہے کہ 'ہم ہی اور تم ہی کی جگہ ہمیں اور تمہیں محاورہ ہے'۔ اگلا مصرع ملاحظہ ہو 'جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی'۔ اِس مصرع پر طبا طبائی کے اعتراضات دیکھیے 'سب تشبی ہیں لطیف ہیں، لیکن حاصل شعر کا دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔۔۔ دونون متعاقب عیب تنافر رکھتی ہیں اور دو دالیں بھی جمع ہو گئی ہیں۔'' (مطلب یہ کہ صوتی طور پر گراں گزرتا ہے)۔ ایک اور مصرع پر اعتراض دیکھیے 'جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے'۔ اِس پر طبا طبائی کہتے ہیں کہ 'گفتار میں آنا بات چیت کرنے کے معنی پر اردو کا محاورہ نہیں ہے، ترجمہ ہے'۔ غالب کے کلام میں طبا طبائی نے اور بھی کئی اغلاط کی نشاندہی کی ہے مگر میرا غالب کے عاشقوں کی مزید دل آزاری کا کوئی ارادہ نہیں اس لیے فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔ فدوی کی روزِ اوّل سے یہ رائے رہی ہے کہ جس شعر کا مطلب سمجھنے کے لیے کونسل کا اجلاس بلانا پڑے اُس شعر کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ فدوی اور طبا طبائی کے خیالات میں زیادہ فرق نہیں، یہ اور بات ہے کہ میں ذرا 'بیمار شمار' رہا ہوں۔

فارسی کا محاورہ ہے 'خطائے بزرگاں گرفتن خطا است' مگر کبھی کبھی ایسی غلطیاں پکڑنے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ ●●

بشکریہ روزنامہ دنیا، پاکستان

21 جون، 2020

عبد الحلیم شرر بحیثیت انشائیہ نگار

بلال احمد ڈار

عبدالحلیم شرر کی پیدائش 1860ء میں لکھنو میں ہوئی۔ان کے بزرگ عالم اور ہنرمند تھے اوران کی علم دوستی اور ہنرمندی کے ذریعہ ہی ان کا تعلق دربار اودھ سے قائم ہوا۔نو برس کی عمر میں شرر کلکتہ چلے گئے اور والدین کے ساتھ مٹیا برج میں رہنے لگے۔شرر کے والد اور نانا کو واجد علی شاہ سے بڑی قربت حاصل تھی اور یہی وجہ ہے کہ شرر کو شہزادوں کی صحبت ملی۔خوبصورت اور رنگین ماحول میں شب و روز گزارنے کا موقع ملا جس کی وجہ سے وہ آرام طلبی اور بے فکری کے شکار ہو گئے۔اس کے بعد شرر کو واپس لکھنو بلا لیا گیا لیکن مٹیا برج کے قیام نے ان کے ذہن،فن اور فکر پر ان گنت نقوش چھوڑ دیئے۔لکھنو کا ماحول بھی شرر کو بہت راس آیا۔یہاں پہنچتے ہی مولانا عبدالحئی کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے اور مختلف کتابوں کا مطالعہ شروع کیا۔دیکھتے ہی دیکھتے شرر کی دلچسپی بڑھتی گئی اور انہوں نے قلیل عرصہ میں اچھے ناول نگار،ڈراما نگار،انشائیہ نگار،سوانح نگار،صحافی،نقاد اور مضمون نگار کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کی۔

مولانا عبدالحلیم شرر 1857ء کے اندوہناک حادثے کے کچھ ہی سال بعد پیدا ہوئے تھے۔مسلمانوں کی تاریخ پر عبدالحلیم شرر کی گہری نظر تھی اور انہیں دکھ تھا کہ مسلمانوں کی قدریں ختم ہوتی جارہی ہیں اس کیفیت کو انہوں نے ناول نگاری کے ذریعے مسلمانوں تک پہنچایا۔اگرچہ شرر کو تاریخی ناول نگار کی حیثیت سے جانا جاتا ہے لیکن ناولوں کے علاوہ انہوں نے وہ کام بھی کیے جنہوں نے اردو ادب میں ان کی مختلف حیثیتوں کو مستحکم کیا ہے اور انہیں بطور نثر نگار کے متعارف کروایا ہے۔شرر کی بہت ساری حیثیات ہیں ان کی ہمہ جہت شخصیت کا ادراک ان کی غیر افسانوی نثر کے ذریعے سے ہوتا ہے۔شرر نئی تہذیب کے خلاف نہیں تھے اور نہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کی تہذیبی اقدار کو برقرار رکھنا چاہیے۔زمان و مکان اور ماحول نے مل کر شرر کی زندگی کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ان کے دل میں جوش و خروش اور حرکت و عمل کا جذبہ پیدا کیا۔انہوں نے ایک ادیب اور صحافی کی حیثیت سے ہندوستانی قوم و ملت کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کی بہت کوششیں کیں۔شرر خود تو لکھنو کی گنگا جمنا تہذیب کے ساخت و پرداخت تھے ان لیے ان کی تصانیف میں ان سب عناصر کی دلکش آمیزش دیکھنے کو ملتی ہے جن کے تحت انہوں نے اپنی زندگی کے نشیب و فراز سے گزر کر اپنی ذہنی و فکری عمل کی تشکیل کی۔

عبدالحلیم شرر کے نثری کارناموں میں جہاں تک انشائیہ کا تعلق ہے انہوں نے سرسید،حالی،اور محمد حسین آزاد کی طرح بہت سارے اہم اور غیر اہم موضوعات پر قلم اُٹھایا۔انہوں نے اپنے انشائیوں میں نہ صرف زندگی کے ٹھوس حقائق کو جگہ دی بلکہ حسن و عشق کے معاملات کو بھی انشائیوں کا موضوع بنا کر انہیں حقیقت نگاری اور رومانیت کا ایک حسین قوس قزح بنایا۔عبدالحلیم شرر اردو ادب کے بحر و کنار ہیں۔اپنی اتھاہ گہرائیوں کا شاید انہیں بھی علم نہ تھا لیکن اہل ادب جانتے ہیں کہ ان کی شخصیت میں بیک وقت ناول نگار،سیرت نگار،سوانح نگار،مکتوب نگار،صحافی،شاعر،مضمون نگار اور انشائیہ نگار اپنی اپنی سبھا سجائے بیٹھے ہیں۔شرر کے انشائیے شاعرانہ حسن بیان،شخصیت کے دلکش انعکاس اور مظاہر فطرت کے مخفی گوشوں کے انکشافات کے ساحرانہ عمل سے عبارت ہیں۔ان کے انشائیوں میں ایک ایسا انسان سامنے آتا ہے جس کے احساسات بے حد نازک ہیں۔انہوں نے اپنی شخصیت کا جتنا اظہار انشائیہ میں کیا ہے کسی اور صنف سخن میں نہیں کر سکے ہیں۔

عبدالحلیم شرر نے انشائیہ کے سلسلے میں وہ دروازہ اختیار کیا جہاں سے دبے پاؤں وہ داخل ہوئے لیکن انہوں نے تھوڑے ہی عرصے میں اتنے انشائیے لکھ دیے کہ ان کا شمار بھی اچھے انشائیہ نگاروں میں ہونے لگا۔یہی وجہ ہے کہ بہت سے ادیب اور محقق مضامین شرر کے شاعرانہ و عاشقانہ حصوں کو انشائیہ کی ذیل میں شمار کرتے ہیں۔اگر سرسید احمد خان کے انشائیہ کی ذیل میں آنے والے مضامین اور محمد حسین آزاد کی نیرنگ خیال کے بعد کی نثری کاوشوں کا انشائیہ کے لحاظ سے جائزہ لیں تو اس عہد کے بیشتر قلم کاروں کے ہاں ایسی تحریریں ضرور مل جائیں گی جن میں نگاہ کی تازگی،اسلوب کی لطافت اور تدبیر کی نزاکت کی صورت میں انشائیہ کی کسی نہ کسی خصوصیت کی جھلک نظر آجائے گی۔اردو انشائیہ کا ابتدائی دور محمد حسین آزاد سے شروع ہوتا ہے۔اس دور میں خواجہ حسن نظامی،عبد الحلیم شرر،مرزا فرحت اللہ بیگ اور ملا رموزی نمائندہ ادیب ہیں۔ان کی تحریروں اور نگارشات میں ایسے نمونے ضرور ملتے ہیں جو انشائیے سے تعلق رکھتے ہیں۔یہ ادب پارے انشائیہ کے فن کے فریم میں فٹ نہیں ہوتے مگر انشائیہ نگاری میں یہ انشائیہ نما تحریریں قابل مطالعہ قرار دی جائیں گی۔

انشائیہ نگاری میں عبدالحلیم شرر کو جو اہمیت ابھی تک دی جاتی رہی ہے ان کے انشائیے اس سے کہیں زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔انشائیہ نگاری میں سرسید اور محمد حسین آزاد کے بعد شرر ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ان کی انشائیہ نگاری ان کے دیگر ادبی کارناموں تلے دبی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔شرر کے انشائیوں کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو ان میں وہ تازگی اور خیال آفرینی موجود ہے جس کا تقاضا ہم دور جدید کے انشائیہ نگاروں سے کرتے ہیں۔

7006615906

شرر نے اپنے انشائیوں میں ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جن پر لکھنا ایک عام ادیب کے لیے بہت ہی مشکل اور کٹھن معاملہ ہے۔ایک چھوٹے ذرّے کی سرگزشت، ایک روپیہ کی سرگزشت، مغرور جوتا جیسے موضوعات سے لے کر انہوں نے کل، نہیں، ہاں، ہم، آج اور ہم تم جیسے موضوعات پر بھی قلم اُٹھایا ہے۔ یہ انشائیے شرر کی زندگی ہی میں نصاب کی کتابوں میں شامل ہو کر دادِ تحسین حاصل کر چکے تھے۔ان انشائیوں میں تخیل کی شادابی، تاریخ کو احساس میں بدل دینے کی حیرت ناک صلاحیت اور اسلوب کی شگفتگی اور رنگینی آپس میں شیر وشکر ہو کر رہ گئی ہیں۔انشائیہ کی ہیئت کیسی ہونی چاہیے اور اس کا مواد کیا ہونا چاہیے اور اس کی حدیں کہاں تک ہونی چاہیے یہ سب شرر کے ان انشائیوں سے ہی سیکھا جا سکتا ہے۔رشید حسن خان رقمطراز ہیں:

''شرر کا دوسرا قابل قدر اور قابل ذکر کارنامہ انشائیہ نگاری ہے۔وہ اردو کے اولین انشائیہ نگاروں میں سے ہیں۔موضوعات کا تنوع، عبارت کی شگفتگی، مختصر جملے اور تصنع سے معرا اسلوب ان کی خصوصیات ہیں۔اگرچہ کہیں کہیں فارسی عربی کے کچھ بوجھل لفظ بھی آجاتے ہیں لیکن ایسا کم ہے۔خیالات میں شگفتگی ہے۔ناول نگاری نے جزئیات کی تصویر کشی کا رنگ چمکا دیا تھا۔ان عناصر کی بنا پر ان کے انشائیے خاصے دلچسپ ہیں۔البتہ خیالات میں جتنی شگفتگی ہوتی ہے، عبارت میں اتنی شگفتگی نہیں ہوتی او ر اس سے کچھ نقصان پہنچتا ہے۔''(گزشتہ لکھنو، عبدالحلیم شرر ، مرتب :رشید حسن خان، جامعہ مکتبہ دہلی 2000ء، 31-30)

شرر معمولی واقعات وموضوعات کی روشنی میں زندگی کی ناہمواریوں اور بوالعجبیوں کا پردہ فاش کرتے ہیں اور ان پر غور وفکر کرنے کے لیے قاری کو دعوت دیتے ہیں۔شرر کا انداز بیان کبھی کبھی بے حد رنگین ہو جاتا ہے لیکن زیریں سطح پر فکر کی لہریں پھر بھی دوڑتی نظر آتی ہے۔قاری اسلوب سے زیادہ متن پر غور کرنے لگتا ہے۔اپنے ناولوں کے مقابلے میں شرر اپنے انشائیوں میں ایک مصور کی حیثیت سے زیادہ کامیاب نظر آتے ہیں۔وہ مناسب الفاظ اور ترکیبوں سے تصویر بنا کر رکھ دیتے ہیں۔ان کی باریک نظر ان جزئیات تک پہنچتی ہے جہاں تک عام نگاہیں نہیں پہنچ پاتیں۔اپنے انشائیہ ''غریب کی جھونپڑی'' میں غریب کی جھونپڑی کا چراغ مفلسوں کی زندگی کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔مٹی کے ایک ٹمٹماتے ہوئے معمولی سے دیے کی روشنی میں شرر ایک کامیاب مصور کی طرح ہمیں غریب کی جھونپڑی کے اندر اور باہر کی سیر اس طرح کراتے ہیں کہ انسان اپنا دل تھامنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اس جھونپڑے کو دیکھتے ہو کتنا مختصر ہے۔بنانے والے نے اپنے سر نیچر کا احسان لینے میں بھی بڑی بے پروائی کی ہے۔اگرچہ چاروں طرف بہت جگہ خالی پڑی ہوئی ہے مگر وہ زمین کا بہت ہی تھوڑا حصّہ اپنے استعمال میں لایا ہے۔ایک چراغ اندر ٹمٹمار ہا ہے اور ٹٹیوں کی درزوں سے اس کی زرد زرد روشنی نکلتی ہے اور باہر کی اونچی نیچی غیر سطح زمین پر ایک سنہرے سینکیے کی وضع بنا دیتی ہے۔یہ روشنی اس قدر ہلکی م، ماند اور دھیمی ہے کہ موسم سرما کا کہرا بہت نزدیک ہی اس کا اثر مٹا دیتا ہے۔اندر ایک چھوٹا سا خاندان زندگی بسر کر رہا ہے۔جھونپڑے کا مالک یا اس خاندان کا جفاکش بادشاہ بیٹھا حقہ پی رہا ہے۔اپنا فرض ادا کر چکنے کی خوشی دنیا کی سب خوشیوں سے بڑھی ہوئی ہے۔وہی خوشی ایک دل کو روشن کر دینے والے نور کے مثل اس چہرے پر چمک رہی ہے۔(غریب کا چراغ)

شرر کے انشائیے اُس دور کے تہذیب وتمدن، سماج اور معاشرے پر ایک بے لاگ تصویر ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔ان کے انشائیوں کے موضوعات میں وسعت، تنوع اور خیال کی ندرت ملتی ہے۔دیہات کی زندگی کے معائب ومحاسن بھی ان کے انشائیوں میں نظر آتے ہیں۔ٹوٹے ہوئے کھنڈروں کی سیر سے درسِ عبرت بھی ملتا ہے اور اُجڑی ہوئی بستیوں پر تاسف بھی ہوتا ہے۔شرر نے اپنے انشائیوں میں اسلوب کی رنگینی کے لیے شعوری کاوش نہ کی حالانکہ 'نسیم سحر' اور 'لالہ خودرو' جیسے انشائیوں میں ایسے اسلوب کی گنجائش تھی مگر وہ تشبیہات اور استعارات سے صرف اتنا کام لیتے ہیں کہ ان سے صرف موضوع میں نکھار پیدا ہو جائے اور کچھ نہیں۔لالہ خودرو کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''بات صرف یہ ہے کہ جس چیز کی آبیاری قدرت کرتی ہے اور جس چہرے میں نیچر کی مشاطہ کا سحر آفریں ہاتھ لگ جاتا ہے اس کے جذبات اس درجہ بڑھ جاتے ہیں کہ دیکھتے ہی دل یک بیک ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔دنیا ہر پہلو سے اس امر کا تجربہ کرا رہی ہے کہ انسانی تکلفات اپنی صناعیوں سے چاہے جس قدر کرشمے دکھائیں مگر قدرت کی ایک ادنیٰ سی کاریگری اپنی سادگی کا تماشا دکھا کر سارے کرشموں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔یہ وہ مقام ہے جہاں سے خالقیت اور مخلوقیت کا نازک اور واجب التسلیم مسلۂ ثابت کیا جاتا ہے۔''(لالہ خودرو، مشمولہ، اردو ایسیز: ظہیر الدّین مدنی، ص 66)۔

عبدالحلیم شرر کے انشائیوں میں فکر کی جو تازگی ملتی ہے وہ قاری کو اسلوب میں گم نہیں ہونے دیتی بلکہ کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔یہ گہرا تفکر نہیں ہوتا بلکہ یوں ہی پڑھتے پڑھتے اچانک ٹھٹک جانے کی ایک کیفیت ہوتی ہے اس لیے وہ اصلاحی نکتہ سمجھانے میں سرسید کے برعکس واشگاف نہیں ہو جاتے بلکہ انشائیہ کا لطیف انداز برقرار رکھتے ہیں۔شرر نے تقریباً ایک ہزار انشائیے تخلیق کیے ہیں جو مختلف رسالوں میں چھپتے رہے خاص طور پر دلگداز میں ان کے انشائیے مختلف عنوانات کے تحت کئی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ان انشائیوں میں علمی، ادبی، تاریخی، جغرافیائی، تنقیدی، مذہبی، سوانحی وغیرہ شامل ہیں۔مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عبدالحلیم شرر کے مضامین کی جتنی بھی جلدیں ہیں ان میں انشائیے مل جاتے ہیں۔شرر نے جس زمانے میں لکھنا شروع کیا تھا اس زمانے میں انشائیہ ایک صنف کی حیثیت سے متعارف نہیں ہوا تھا لہٰذا شرر نے الگ سے اپنے انشائیوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔لیکن انہوں نے جو مضامین لکھے ہیں ان میں انشائیے کی کچھ خصوصیات موجود ہیں جن کی وجہ سے ان کو انشائیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔اردو انشائیہ کا جب بھی تذکرہ آئے گا تو عبدالحلیم شرر کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہی سمجھا جائے گا۔ ●●

بچوں کی نفسیات اور ادب اطفال

محمد مصدق

بچے ہماری قومی امانت ہیں ملک وقوم کا مستقبل اور مستقبل کے معمار بھی ہیں اس امانت کے تحفظ کی ذمہ داری قوم کے ہر فرد پر واجب ہے لیکن اس کا تحفظ اور اس کی پرورش و پرداخت کا فریضہ انہیں محض اچھی غذا عمدہ لباس اور قیمتی کھلونے فراہم کردینے سے ادا نہیں ہوجاتا بلکہ ان کی جسمانی نشو ونما کے لیے مناسب سہولیات مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی عمدہ ذہنی تربیت کا بندو بست بھی ضروری ہے اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب ہم بچوں کی ذہنی تربیت کے لیے شروع سے ہی انکی نفسیاتی ضرورتوں کے پیش نظر مناسب اقدام کریں ان کے لیے ایسے ادبی مواد فراہم کریں جو تفریح کے ساتھ ساتھ ان کے معلومات میں اضافہ کرے ان کی ذہنی بالیدگی اور جذباتی آسودگی کا باعث ہو ان کی زندگی کو سنوارے اور ان کے کردار کو جلا بخش کر مستقبل کا اچھا انسان بننے کی راہ ہموار کرے۔

انسانی شخصیت کی ہر خوبی اور خامی، ہر کمال اور نقص کی جڑیں اس کے بچپن میں پیوست ہوتی ہیں، بچپن میں ملنے والا ماحول، تعلیم، تربیت، مشاہدات، تجربات، حادثات اور رویے انسان کے کردار کو تراشتے ہیں، سنوارتے ہیں یا بگاڑتے ہیں۔ بچوں کی تربیت ایک محنت طلب ذمہ داری ہے اس کے لیے انتہائی نگہداشت اور توجہ درکار ہوتی ہے۔ یہ کام بغیر کامل منصوبہ بندی کے ممکن نہیں۔ بچوں کا ذہن ایک زرخیز کھیت کے مانند ہوتا ہے، اس میں کمال کا ایک ایک پودا بونا پڑتا ہے، نقائص کی خود رو جھاڑیاں نکال کر الگ کرنی پڑتی ہے، ایمان، تقویٰ، تدین، حب الٰہی، خوف خدا، توکل، انابت، قناعت، سخاوت، شرافت، شجاعت، خود اعتمادی، رقت قلب، حیا، غیرت، کظم غیض، صبر وتحمل، ایمانداری، عہد کی پاسداری، سلیقہ شعاری، راست بازی، خوش گفتاری، حسن خلق، عاجزی و انکساری، محنت کشی، انصاف پسندی، وقار اور سنجیدگی غرض کہ انسانی شخصیت کے ہر کمال کا بیج جب بچپن کی زمین پر بویا جاتا ہے تو عمر کی پختگی کے ساتھ کردار میں اس کے ثمر بار آور ہوتے ہیں۔ تربیت کوئی خود کار کام نہیں، اس کے لیے ہر ہر قدم پر محنت درکار ہوتی ہے۔ بچوں کے ذہنی رجحانات اور نفسیاتی تقاضے کو بڑی دقت کے ساتھ مدنظر رکھنا پڑتا ہے۔ بچے کی پیدائش سے لے کر اس کی مکمل نشو ونما تک علم نفسیات بہت اہم رول ادا کرتا ہے، بچوں کی نفسیات ہی بچوں کے ادب کو جنم دیتی ہے۔

بچے کی نفسیات اور ان کے ذہنی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کئی صنف ادب وجود میں آئے نظم، لوری، گیت، کہانی، تصویر، قصے، ڈرامے، مضمون اور اس قسم کی مختلف اصناف بچوں کے لیے لکھی گئیں۔

پھر جیسے جیسے تہذیب وتمدن میں تبدیلیاں آئیں بچوں کی نفسیات بھی متاثر ہوتی رہی اور اس کے تقاضے بھی بدلتے رہے اور اس کی تربیت کے طریقہ کار بھی، اگر ہم صرف سو سال پہلے کی بات کریں تو آج کے اور اس وقت کے ماحول، سماجی اور سیاسی حالات نیز اخلاقی اور مذہبی رجحانات میں زمین و آسمان کا فرق بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے آج دنیا بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی طرف گامزن ہے جدید سائنسی آلات، ایجادات وانکشافات اور جدید ٹیکنالوجی نے بچوں اور بڑوں کی زندگی میں انقلاب برپا کردیا ہے۔

آج کے بچے اب پہلے جیسے نہیں رہے، اس دور کے بچے ذہنی اعتبار سے بہت سمجھدار ہیں انکی قوت متخیلہ بہت تیز ہے۔ ان سب باتوں کے پیچھے نفسیات کا بڑا ہاتھ ہے۔ بچے بڑے ذہین اور حساس ہوتے ہیں، لیکن بعض اوقات بچوں کی ذہنیت اپنے بڑوں کی غیر دانشمندانہ رویوں کا شکار ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ بچوں کی نفسیات کا خیال نہ رکھتے ہوئے ان پر بے جا دباؤ ڈال کر انکو اپنی مرضی کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ بچے بعد میں غصیلے شورہ پست نوجوان کہلاتے ہیں۔ اور یہ روش بچے کی شخصیت کو ابھرنے نہیں دیتی ہے۔ بچوں پر بے جا دباؤ نہیں ڈالنا چاہیے۔ بچہ ہر چیز کے بارے میں ایک خیال رکھتا ہے وہ ہر چیز کو اپنی نگاہ سے دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کرتا ہے یہ اس سوجھ بوجھ کا نتیجہ ہے جو پیدائش سے ہی بچے میں ہوتی ہے اور بہت تیزی سے بڑھتی ہے اگر اس سے ہٹ کر کوئی چیز اس کے سامنے رکھی جاتی ہے تو وہ قطعی پسند نہیں کرتا، اس لیے اگر ہم کو ان کے ساتھ انصاف کرنا ہے تو ان کے خیالات اور خیالات کا اظہار اور ان کی عملی پہلوؤں کو اہمیت دینا ہوگی۔

بچے کی نفسیات کو وسیلہ بنا کر اپنی بات ان کے ذہنوں میں منتقل کی جاسکتی ہے لیکن اس بات کو ماننے یا نہ ماننے کا بچوں کو پورا حق ہے یہ منظوری یا نا منظوری بچوں کے اس مستقبل پر منحصر ہے جو وہ خود بناتے ہیں اور اس میں ان کے ماحول کا پورا ہاتھ ہوتا ہے۔

بچے خود کو مستقبل کے لیے تیار کرنا چاہتے ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی مدد کریں۔ جان اینڈرسن نے لکھا ہے:

The child is engaged in an on going process of development.

زندگی ہمیشہ حال میں ہوتی ہے اور مستقبل کی طرف بڑھتی ہے۔

بچوں کو کتابیں بھی ایسی ہی پسند آتی ہیں جو ان کے مستقبل کو بنانے میں معاون ثابت ہوں ایسی کتابیں نہیں جو حال کا آئینہ نہیں اور بچوں کے تصورات کے اڑن کھٹولے کو ان کے مستقبل تک نہ لے جاسکے۔ اسی وجہ سے جن اور پریاں جیسے مافوق الفطرت کردار اور واقعات اب اپنی دلچسپی کھوتے جارہے ہیں۔ اب بچے

ہوائی جہاز، راکٹ، اور مصنوعی سیارے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ بچوں میں نفسیاتی تبدیلی خود بخود آ رہی ہے۔

مناسب جسمانی اور ذہنی نشو ونما کے لیے بچوں کی نفسیات کا گہرا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ بچوں کی نفسیات کوئی ایسا مشکل موضوع بھی نہیں ہے جس کو عام والدین نہ سمجھ سکیں، حقیقت یہ ہے کہ بچے کی حرکتیں، عادات واطوار، مزاج اور اس کے رجحانات کا صحیح پتہ لگانا اور مستقبل کے لیے ان کی صحیح راہنمائی کرنا ہی بچوں کی نفسیات ہے۔

بچہ ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے وہ ان تمام حالات کا اپنے طرز پر مقابلہ کرتا ہے۔ جو اس کے سامنے آتے ہیں اس کے برتاؤ کی یہ منزل خاص طور پر قابل توجہ ہے، بچے کی یادداشت اس کے مطالعہ کی دلچسپی اس کے جذبات سب ہی کو الگ الگ دیکھنا ضروری ہے۔ بچہ ایک ایسے ماحول میں رہتا ہے جو اس کے مزاج، برتاؤ اور اس کی بڑھتی ہوئی ترقی کو برابر متاثر کرتا ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کا جذبہ اسی ماحول سے پیدا ہوتا ہے اور وہ اس ماحول سے اپنے مستقبل کے لیے راہیں منتخب کرتا ہے۔ بچوں میں سارے کام کرنے کی صلاحیت تو ہوتی ہے لیکن وہ بڑے کے بتانے اور سکھانے سے ہی ابھر کر سامنے آتی ہے۔[۲۰]

نپولین نے ایک بار انسانی نفسیات کو جاننے کے لیے بیس بچوں کو جن کی عمر چند ماہ تھی دو سال تک اکیلے رکھا اسے کھلایا پلایا جاتا لیکن ان سے بات کرنے کی کسی کو اجازت نہیں تھی۔ دو سال تک بچوں کو اسی طرح رکھا گیا۔ تجربہ کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے زیادہ تر گونگے ہوگئے اور کچھ بچوں کا یہ گونگا پن دائمی ہوگیا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ اگر ہم بچوں کو کوشش کر کے زبان نہ سکھائیں تو وہ بولنا بھی نہ سیکھیں گے۔ سماج کے سبھی خیالات، افکار، عادات اور اطوار جن سے وہ اپنی زندگی کی گاڑی چلاتا ہے سیکھنے سے ہی آتے ہیں۔

انسان میں سیکھنے کی فطرت سب سے زیادہ ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ بچپن سے ہی اپنے بڑوں اور اطراف کے ماحول سے سیکھتا رہتا ہے اور اپنی فطری رجحانات کو آہستہ آہستہ پروان چڑھاتا ہے۔

مگر یہ فطرت اور رجحانات فطری طور پر تبدیل بھی ہوتے ہیں ان تبدیلیوں پر نظر رکھنے کی سخت ضرورت ہے ورنہ بچے گمراہ ہو سکتے ہیں۔ بچوں کی فطری صلاحیتوں کو اس طرح ابھرنے دینا چاہئے کہ بچے کی جسمانی اور ذہنی نشو ونما میں کوئی رکاوٹ نہ آئے۔

بچوں کے چند فطری رجحانات کی یہاں تلخیص کی جاتی ہے:

(۱) تجسس (Curiosity): تجسس کا مادہ ہر انسان میں ہوتا ہے بچوں میں تجسس کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ بچہ ہر واقعہ اور شئی کی جزئیات سے واقف ہونا چاہتا ہے اس میں جاننے کی خواہش بدرجہ اتم موجود ہے اور وہ ہمہ وقت کسی نہ کسی جستجو میں رہتا ہے یہی وہ مادہ ہے جو اسے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے میں مدد دیتا ہے اور اس کی شخصیت کی تعمیر میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

بچے کے ذہن میں کیا، کیوں، کیسے اور کب جیسے سوالات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے سوالات کا جواب تشفی بخش طریقے سے دیا جائے۔ بچہ کو سوال کرنے پر کبھی نہ جھڑکا جائے نہ ہی سوال کرنے سے منع کیا جائے بلکہ اس پر حوصلہ افزائی کی جائے کیوں کہ اگر اس جذبہ کو ہم بچپن میں ہی دبا دیں گے تو بچے کی معلومات محدود رہ جائے گی اور بچے کا ذہن تیزی سے ترقی نہیں کر پائے گا۔ چوں کہ تجسس بچے کی نظریات میں شامل ہے اس لیے ادب اطفال میں بچے کی فطرت کے مطابق موضوع اور طرز تحریر کا انتخاب کرنا چاہئے۔

(۲) عملی رجحانات: کچھ نہ کچھ کرتے رہنا بچوں کی عادت میں شامل ہے وہ سکون سے بیٹھ نہیں سکتا کچھ نہ کچھ تعمیری یا تخریبی کاموں میں لگے رہنا ہے۔ یہ توڑ پھوڑ اور برباد کرنے سے بظاہر سراسر نقصان ہے مگر بچوں کے اس تعمیری اور تخریبی عمل سے ہی ان میں کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کی عادت کی نشو ونما ہوتی ہے جو انھیں تعمیر اور تخیل کی طرف لے جاتا ہے، تعمیری افعال اور تخیل میں بڑا گہرا تعلق ہے۔

مشینوں کے الگ الگ پرزے والے پلاسٹک کے کھلونے، حروف کو جوڑ کر لفظ تیار کرنے والے کھلونے، مٹی کے گھر، ریت کے گھروندے، گڑیا یا گڈے کی سجاوٹ وغیرہ میں بچوں کی دلچسپی اسی فطرت کا نتیجہ ہے، اس طرح بچوں میں کچھ نہ کچھ کرنے کی عملی پہلو کے ساتھ خود اعتمادی بھی پیدا ہوتی ہے۔

(۳) خود نمائی کی عادت: خود نمائی کی عادت بچوں میں ہی نہیں بڑوں میں بھی ہوتی ہے خصوصاً بچیوں میں یہ عادت زیادہ ہوتی ہے۔ بچہ خود جو کچھ ہے اور جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کی نمائش چاہتا ہے اسے دنیا والوں کو دکھانا چاہتا ہے۔

بقول ڈاکٹر سلیم اختر:

''بچے کا ایک اہم نفسیاتی مسئلہ یہ ہے کہ وہ بڑوں کی توجہ اور محبت کا طالب ہوتا ہے وہ چاہتا ہے سب کا مرکز توجہ بنا رہے سب لوگ اس کو سراہیں وہ جو کچھ کرے اس پر اسے داد ملنی چاہئے''

اسی طرح بچہ کسی کے مقابلہ میں خود کو کمزور نہیں تصور کرتا یہ فطرت بڑا ہونے پر بچے کو باہمت اور بہادر بناتی ہے۔ تعلیم، کھیل کود اور خدمت کے میدان میں یہ عادت بڑے کام انجام دیتی ہے۔ اس فطرت کی صحیح نشو ونما ضروری ہے ورنہ بچہ باغی اور سر پھرا ہو جائے گا۔

کچھ والدین دوسروں کے سامنے اپنے بچوں کی برائی کرتے ہیں اس سے بچے کی 'انا' کو ٹھیس پہنچتی ہے اس کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اسی طرح کچھ لوگ بچے کے سامنے ہی اس کی بہت زیادہ اور بے جا تعریف کرتے ہیں۔

یہ بات بھی بچے کے مستقبل کے لیے نامناسب ہے اس سے بچے میں خواہ مخواہ احساس برتری پیدا ہو جاتی ہے اس لیے بچے کی اس فطرت پر بہت زیادہ احتیاط سے نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ بچہ نہ تو احساس کمتری کا شکار ہو اور نہ احساس برتری کا کیوں کہ یہ دونوں ہی چیزیں بچے کے مستقبل کے لیے نہایت نقصاندہ ہیں۔

(۴) اپنی چیزوں کو جمع کرنا اور ان کی حفاظت کرنا: اپنی دلچسپی اور اپنے استعمال کی چیزوں کو حاصل کرنے اور ان کو جمع کرنے میں بچوں کو خاصی دلچسپی ہوتی ہے وہ انھیں بڑی حفاظت سے چھپا کر رکھتے ہیں اگر چہ وہ چیزیں بڑوں کی نگاہ میں معمولی اور بے قیمت ہوں مگر بچوں کے نزدیک بہت اہم اور قیمتی ہوتی ہیں جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے ہیں ان کی دلچسپی میں تبدیلی آتی رہتی

ہے بچوں کی اس فطرت پر بندش عاید نہیں کرنی چاہئے کیوں کہ اس سے متاثر ہوکر وہ اپنی ضرورت کی چیزوں کی حفاظت کرتے ہیں، اگر بچوں کی اس فطرت کو دبانے کی کوشش کی گئی تو وہ لاپرواہ اور غیر ذمہ دار بن جائیں گے۔ اسی طرح اگر یہ عادت حد اعتدال سے بڑھ گئی تو پھر وہ لالچی، کنجوس اور خود غرض ہو جائیں گے اس وجہ سے اس فطری رجحان کی نشو ونما میں بھی توازن ضروری ہے۔

(۵) احترام اور فرمابرداری: ہر بچہ میں اپنے بڑوں کے تئیں احترام اور فرماں برداری کا جذبہ پایا جاتا ہے اور یہ بچوں کے روشن مستقبل کی خاطر مطلوب بھی ہے اگر بچہ میں یہ فطرت نہ ہو تو سماج میں اس کا جینا مشکل ہو جائے اس لئے اخلاقی اور سماجی دونوں اعتبار سے بچوں میں اس عادت کو فروغ دینا ضروری ہے۔ بچے ان کا احترام اور فرماں برداری زیادہ کرتے ہیں جن سے انھیں محبت وعقیدت ہوتی ہے اور جن سے وہ متاثر ہوتے ہیں اس لئے بڑوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ محبت اور پر تاثیر انداز میں ہدایت و احکام دیں حاکمانہ اور جارحانہ انداز اختیار نہ کریں کیوں کہ اگر بڑوں کی نصیحت و ہدایت کا انداز جارحانہ ہو تو بچے بے ادب، نافرمان اور باغی ہو جائیں گے۔

(۶) نقل وتقلید کرنا: نقالی انسان کی فطرت کا سب سے طاقتور داعیہ ہے۔ انسان کا تقریباً نوے فی صد عمل نقل وتقلید پر مبنی ہوتا ہے، بچوں میں یہ فطرت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بچوں کے سیکھنے کی ابتداء بھی نقالی سے ہوتی ہے یہ فطرت بچے کی جسمانی اور ذہنی نشو ونما کے لیے بے حد ضروری ہے۔ اسی فطری رجحان کے باعث بچے بڑوں کی طرح مہذب زندگی گذارنے کے لائق ہوتے ہیں، پاکی صفائی، سلیقہ، وقت پر اپنا کام کرنا، صبح سویرے اٹھنا، عبادت کرنا، مطالعہ کی عادت، دوسروں کے ساتھ ہمدردی وخوش اخلاقی یہ سب چیزیں بچے، بڑوں سے سیکھتے ہیں، اگر گھر کا ماحول خوش گوار ہے پاس پڑوس کے رہنے والے مہذب ہیں تو بچہ بھی مہذب بن جائے گا۔ اس کے برخلاف اگر گھر اور پاس پڑوس میں انتشار، لڑائی جھگڑا اور گندگی ہے تو بچہ غیر مہذب ہو جائے گا۔

(۷) مقابلہ: بچوں میں دوسروں سے اپنا تقابل کرنے کی خوبی ہوتی ہے۔ تعلیم، کھیل کود، رہن سہن، محنت اور خدمت کے کاموں میں بچوں میں مقابلہ کا جذبہ ہوتا ہے اس فطرت کے سبب بچے دوسرے بچوں پر سبقت لے جانا چاہتے ہیں۔ مقابلے کے دو پہلو ہیں ایک رشک دوسرا حسد۔ رشک کے تحت بچہ دوسرے سے آگے بڑھنا چاہتا ہے لیکن وہ کسی دوسرے کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا ہے جب کہ حسد میں دوسرے کو نقصان پہنچا کر خود آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ مقابلہ کا پہلو رشک بچے کے لیے بہت مفید ہے لیکن دوسرا بے حد نقصان دہ۔ اس لیے مقابلہ کا جذبہ جب تک یکساں اور صحت مند انداز میں نہ ہو بچے کی نشو ونما پر برا اثر پڑتا ہے۔ حسد کا جذبہ تو بچے میں پیدا ہی نہیں ہونا چاہئے۔ اگر بچے میں صحیح طور پر مقابلے کا جذبہ پیدا ہو گیا تو وہ بہت عقل مند، سمجھ دار، تیز، بہادر اور باہمت بنے گا۔

(۸) ہمدردی کا جذبہ: ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے۔ یہ جذبہ بچہ اپنے آس پاس کے ماحول سے حاصل کرتا ہے، یہ جذبہ بہت اہم ہے، بچوں میں ہمدردی کے جذبہ کو اس طرح فروغ دیا جائے کہ وہ صبر و برداشت اور ایثار سے کام لیتے ہوئے ہر حال میں ہمدردی کا دامن تھامے رہے۔ جس بچہ میں ہمدردی کا جذبہ زیادہ ہوتا ہے اس کے کردار اور زبان میں مٹھاس پیدا ہو جاتا ہے اس کی شخصیت بااثر اور پرکشش بن جاتی ہے اس جذبہ کو بچے کی فطرت میں صحیح ڈھنگ سے ابھارنے کی ضرورت ہے۔

(۹) قوت تخیل: بچوں کے قوت تخیل کی پرواز بہت تیز ہوتی ہے چار پانچ سال کی عمر کے بعد ہی بچے کا ذہن تیزی سے کام کرنا شروع کر دیتا ہے۔ وہ اپنے اردگرد کے ماحول سے متاثر ہوکر سامنے کی چیزوں کے بارے میں مختلف سوالات کرتا ہے اور انھیں سوالات اور جوابات کی مدد سے آہستہ آہستہ اس کے قوت تخیل کی نشو ونما ہوتی ہے۔ علم نفسیات میں تخیل کو ذہن کا وہ فعل مانا گیا ہے جس کے ذریعہ کسی بھی شی کی عدم موجودگی میں اس کا ہو بہو احساس ہوتا ہے۔ تخیل ابتدا میں اپنے ماحول کے دائرہ تک ہی محدود ہوتا ہے پھر تجربات کے ساتھ اس کی پیش رفت ہوتی ہے۔ وہ اپنے بڑوں سے جو کچھ سنتا ہے اس کا تخیل کرتا رہتا ہے۔ کہانی سنتے سنتے بچے کی ذہن میں اچانک ایک منظر ابھرتا ہے اور جیسے جیسے کہانی آگے بڑھتی ہے بچے کا تخیل بھی بچے کو اس منظر کے ساتھ آگے بڑھاتا ہے۔ اس طرح بہت سی غیر متعین اور ان دیکھی چیزوں اور باتوں کی ایک تخیلی شکل بن جاتی ہے۔ کہانیوں کے ذریعہ اس کی قوت تخیل بڑھتی ہے مگر آج کے دور میں خیالی کہانیوں کا تاثر بہت محدود ہو گیا ہے۔ جدید سائنٹفک انکشافات نے ہمارے بہت سے نظریات کو متاثر کیا ہے اور ان کو بدل کر رکھ دیا ہے۔

آٹھ سال کی عمر کو پہنچتے پہنچتے بچہ حقیقی دنیا کو سمجھنے لگتا ہے اور بے بنیاد باتوں کا تخیل اب بچے کو پسند نہیں آتا۔ بچے کے تخیل کی نشو ونما کے لیے کہانیوں کی بڑی اہمیت ہے۔ بچوں کے ادب کی خصوصیات کی بات کریں تو سادگی اور سادہ اسلوب بہت اہمیت رکھتے ہیں بہت سی اچھی نظمیں کہانیاں اور ڈرامے بچوں کی دلچسپی کو ابھارنے میں اس لیے ناکام رہتے ہیں کہ ان کا انداز بیان بچوں کی نفسیات کے اعتبار سے غیر دلکش ہوتا ہے یا بچوں کی اپنی زبان میں نہیں ہوتا۔ غرض کہ بچوں کا ادب اور بچوں کی نفسیات دونوں میں گہرا ربط و تعلق ہے بچوں کی نفسیات کا بھرپور مطالعہ ومشاہدہ کئے بغیر کوئی ادیب اور شاعر ان کے لیے اچھی کتب نہیں لکھ سکتا۔ ادب اطفال کے لیے خود بچے ایک کسوٹی ہیں کیوں کہ وہ اپنی دلچسپی اور شوق سے ہی کتابیں پسند کرتے اور پڑھتے ہیں:

بچوں کی نفسیات کا عمیق مطالعہ ہی بچوں کے ادب کی بنیاد ہے۔

ماخذ:

(۱) ڈاکٹر خوشحال زیدی، اردو میں بچوں کا ادب، ادارہ بزم خضر راہ، کانپور، ۱۹۸۹ء

(۲) سرفراز فیضی، (مقالہ) بچوں کی نفسیات اور تربیت کے تقاضے The Free Lancer, Sep./24/2018

(۳) ڈاکٹر خوش حال زیدی، بچوں کے ادب کی خصوصیات، نہرو چلڈرن اکیڈمی، جنوری ۱۹۹۳ء

(۴) محمد یحیٰ، تعلیم وتربیت کے نفسیاتی پہلو، دانش پی کے اسلام آباد، ۱۵/اگست ۲۰۱۸ء

●●

ایرانی ادیب ‘‘ھوشنگ مرادی کرمانی’’

ایران کے عصری ادبی منظرنامے میں ‘‘ھوشنگ مرادی کرمانی’’ کا نام بہت نمایاں اور مقبول ہے، ان کی شہرت نہ صرف ایران بلکہ عالمی سطح پر بھی ہے۔ وہ بیک وقت ایرانی ادب، ڈراما نگاری اور فلم نویسی کے شعبے میں سند سمجھے جاتے ہیں۔ بچوں کے ادب کے لیے ان کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے اور یہی ان کا سب سے مرکزی اور بنیادی حوالہ بھی ہے۔ وہ گزشتہ کئی دہائیوں سے قلم کی روشنی سے ایرانی قارئین کے ذہنوں کو منور کر رہے ہیں، جن میں اکثریت اطفال کی ہے، جنہیں اپنے تصور کے سارے کردار اور یقین کی منزل ان کی لکھی ہوئی کہانیوں میں ملتی محسوس ہوتی ہے۔ ان کی تخلیقی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے 2017 میں کیمرج یونیورسٹی، برطانیہ نے انہیں ‘‘لائف اچیومنٹ ایوارڈ’’ سے نوازا، ‘‘ھوشنگ مرادی کرمانی’’ ایران کے صوبہ کرمان کے ایک چھوٹے سے گاؤں میں 7 ستمبر 1944 کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے دیہی علاقے سے حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ تعلیم تہران کی جامعہ سے حاصل کی۔

ابتدائی زندگی میں ان کو بہت ساری مشکلات جھیلنا پڑیں۔ بچپن میں ماں سے بچھڑنے کا غم سہنا پڑا، والد ذہنی عارضے میں مبتلا تھے، جس کی وجہ سے کمسنی میں ہی حالات نے ان کو جلدی باشعور اور حساس بنا دیا۔ جن دنوں میں بے فکری بچوں کی میراث ہوتی ہے، یہ ان دنوں کی گھٹن دل میں لیے پروان چڑھے، شاید یہی وجہ ہے، جب ان کو تخلیقی اظہار کا راستہ ملا، تو انہوں نے اپنی تخلیقی منزل ‘‘بچوں کے ادب’’ کو بنایا۔ ایسے بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں، جنہیں والدین کے علاوہ فکری تربیت، رہنمائی اور سہارے کی ضرورت ہوتی ہے، اپنی زندگی کے خلا سے دوسرے بچوں کے زندگیوں کی کمی کو پورا کیا، کیونکہ یہی کہانیاں اور کردار تھے، جنہوں نے بچپن کی مشکل زندگی میں ان کو راحت مہیا کی، اب کئی دہائیوں سے وہ یہ ذہنی آسودگی اپنی قوم کے بچوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔

‘‘ھوشنگ مرادی کرمانی’’ کی کہانیوں کے متعدد مجموعے اور ناول شائع ہو چکے ہیں۔ ان کی شائع ہونے والی کہانیوں کی کتب میں قصّہ ہائے مجید، چکمہ، نخل، داستان آن خمرہ، تنور، کوزہ ہیں۔ خودنوشت کا عنوان ‘‘شما کہ غریبہ نیستید’’ ہے جبکہ ان کے تین ناول مھمان مامان، مشت بر پوست اور مربائے شیریں ہیں، جن پر فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ ان کی تمام کتابیں فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں، جن کے تراجم دنیا کی کئی بڑی زبانوں میں ہو چکے ہیں، ان میں انگریزی، جرمن، فرانسیسی، ہسپانوی، ڈچ، آرمینائن، اطالوی اور عربی سمیت دیگر زبانیں شامل ہیں۔ انگریزی میں معروف امریکی مترجم ‘‘کرولین کروسکری’’ نے ان کی خودنوشت سمیت متعدد تخلیقی کہانیوں کے مجموعوں سمیت ایک ناول کو فارسی سے انگریزی میں براہ راست ترجمہ کیا ہے۔

ایران کے ٹیلی وژن پر ان کی کہانیوں پر مبنی ڈراما سیریز ‘‘قصّہ ہائے مجید’’ بہت مشہور ہوئی، چاہے کوئی ایرانی ادب سے شغف نہ بھی رکھتا ہو، لیکن وہ اس ڈراما سیریز اور اس کے کرداروں سے مانوس ہے، کیونکہ یہ وہ قصے اور کہانیاں ہیں، جس میں ایک عام ایرانی کی زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔ ایران کی ایک پوری نسل ان کہانیوں سے جڑی ہوئی ہے، جنہوں نے پرورش پاتے ہوئے یہ قصے اپنی آنکھوں سے ٹیلی وژن کی اسکرین پر دیکھے۔ ‘‘ھوشنگ مرادی کرمانی’’ کی ایک معروف کہانی، پھر جس کو انہوں نے ناول کی شکل دی اور بعدازاں سینما کی اسکرین کے لیے اسکرپٹ کی شکل میں بھی ڈھالا، اس کا عنوان ‘‘مھمان مامان’’ ہے۔

ان کی کہانیوں میں ‘‘شرم’’ وہ کہانی ہے، جس کو فلم کے پردے پر فلمایا گیا، یہ فلم 1992 میں نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ باقی تین فلمیں جو بنیں، وہ تینوں ان کے ناول تھے، جن میں ‘‘مھمان مامان’’ کے علاوہ ‘‘مربائے شیریں’’ اور ‘‘مشت بر پوست’’ ہیں۔ یہ دونوں فلمیں بالترتیب 2001 اور 2004 میں ریلیز ہوئیں پھر ‘‘مھمان مامان’’ کی نمائش کا سال بھی 2004 ہے اور مقبولیت میں ‘‘مھمان مامان’’ ہی سب سے مقبول ایسی کہانی ہے، جو ڈرامے اور ناول میں بھی ڈھل چکی، اس کو ایرانی ٹیلی وژن اور سینما پر یکے بعد دیگرے فلمایا گیا۔ ‘‘مھمان مامان’’ سے مراد ‘‘ماں کے مہمان’’ ہیں۔ اس فلم کی ہدایات معروف ایرانی فلم ساز ‘‘داریوش مھرجوئی’’ نے دیں، یہ فلم ساز خود ایرانی سینما کا ایک بہت بڑا نام ہیں، جنہوں نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے اس کہانی کو ایرانی سینما بینی میں امر کر دیا۔ 2004 میں یہ فلم ایران میں ریلیز ہوئی اور باکس آفس پر کامیابی بھی حاصل کی۔

ایران کے مقبول ترین ‘‘فجر عالمی فلم فیسٹیول’’ میں اس کو بہترین فلم کا اعزاز بھی دیا گیا، جبکہ دیگر آٹھ شعبوں میں بھی اس کی نامزدگی ہوئی۔ ایرانی سینما کی دس بہترین فلموں میں سے ایک اس فلم کو بھی شمار کیا جاتا ہے، جبکہ اس کہانی کو مغربی ادبی مدیروں کی طرف سے ایرانی بچوں کی سات مشہور کتابوں میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ یہ ساری مقبولیت ‘‘ھوشنگ مرادی کرمانی’’ کی ادبی بلندی کو بیان 7 سالہ یہ ہے گ اب بھی اپنی قوم کے بچوں کے لیے کہانیاں تخلیق کرنے کو پُرعزم ہے، یہی ایک سچے اور حب الوطن ادیب کی نشانی ہے، ایرانی ادبیات کی تاریخ میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ●●

خرم سہیل

بشکریہ جنگ ۲۵ مارچ ۲۰۲۰

اردو زبان و ادب پر مواصلاتی نظام کے منفی اثرات

ڈاکٹر محمد اقبال خان

موجودہ دور کو سائنس وٹیکنالوجی کا دور کہا جاتا ہے۔بیسویں صدی کے آخری چند سالوں اور اکیسویں صدی کے آغاز سے دنیا بھر میں مواصلاتی ٹیکنالوجی جیسے کمپیوٹر، ٹیلی ویژن، انٹرنیٹ، ٹیلی فون، اخبارات ورسائل اور سماجی رابطے کی ویب سائٹوں نے بہت تیز رفتاری سے ترقی کے منازل طے کیے۔اس انقلابی تبدیلیوں نے زندگی کو آسان سے آسان تر بنادیا۔اس تیز رفتار رابطوں کی وجہ سے مقامی ،ملکی اور بین الاقوامی رابطہ بہت بڑھ گیا ہے۔سماجی میل جول ،سیاسی تعلقات ،تجارتی لین دین ،تعلیمی آمدورفت کے علاوہ شعبہ صحت کے معملات کے مسائل تک بہ آسانی رسائی حاصل ہوئی ہے۔غرض ٹیکنالوجی کی اس تیز رفتار ترقی کی وجہ سے دنیا ایک گلوبل ولیج (عالمی گاؤں) بن گیا۔

اسی طرح اگر مواصلاتی نظام کی اس برق رفتاری کے اثرات ادبیات عالم کے ساتھ ساتھ اردو زبان وادب پر بھی دیکھا جائے تو یہ بات عیاں ہے کہ اس نے اردو زبان وادب کو ترقی کی بلندیوں سے ہمکنار کیا ہے۔اردو زبان جو کہ برصغیر کی پہچان ہے اس ٹیکنالوجی کی سہولیات سے برصغیر کے حدود سے نکل کر دنیا کے دوسرے مما لک میں اپنے جلوے دکھانے میں کامیاب ہوئی ۔غرض مواصلاتی نظام کے مثبت اثرات سے تو ہر کوئی واقف ہے لیکن اس نظام کا اگر دوسرا پہلو بھی دیکھا جائے تو اردو زبان وادب پر ایسے پیچیدہ اور غور طلب منفی اثرات بھی سامنے آتے ہیں جن کو ابھی تک نظر انداز کیا جاتا ہے۔موضوع کی نسبت سے چند منفی اثرات کا ذکر پیش ہے۔

زبان دراصل اس بس یا ٹرین کی طرح ہوتی ہے جس پر تھوڑے فاصلے کے بعد مسافر سوار ہوتے یا اُترتے رہتے ہیں یعنی نئے خیالات وافکار یا نظریات ورجحانات ،سیاسی ومعاشی تبدیلیاں وضروریات ،تہذیب وتمدن کے علاوہ مختلف ایجادات اوران کے استعمال سے نئے نئے الفاظ زبان میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔اسی طرح ان مذکورہ تبدیلیوں کے اثرات سے بعض الفاظوں کا استعمال کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہو کے نامانوس رہ جاتے ہیں۔ہماری اردو زبان اس درپیش مسلے کا بہت زیادہ شکار ہورہی ہے۔اردو زبان اس قدر نامانوس طریقوں کے نتائج کی زد میں آرہی ہے،جس سے نہ صرف اس کا حسن متاثر ہورہا ہے بلکہ یہ انحطاط اور تنزل کی طرف بڑھ رہی ہے۔

اگر ہم اپنے ملک ہندوستان کی بات کریں تو ہندی ہماری سرکاری زبان ہے جبکہ بنگالی ، گجراتی ،تلیگو ،مراٹھی ،ملیالم ،تامل وغیرہ یہاں کی دوسری بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔لیکن بدقسمتی سے آئے روز ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد میں کمی آتی رہتی ہے۔سال ۲۰۱۱ء کی تازہ مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق اردو زبان ساتویں پوزیشن پر پہنچ گئی ہے۔جبکہ ۲۰۰۱ء میں اردو چھٹے مقام پر تھی۔آج پورے ملک میں اردو بولنے والوں کی تعداد صرف 4.34 فی صد ہی ہے۔اسی طرح اگر ہم ریاست جموں وکشمیر بالخصوص وادی کشمیر کی بات کریں تو یہاں کی سرکاری زبان اردو ہے جبکہ کشمیر میں کشمیری،لداخ میں لداخی اور جموں میں ڈوگری اور ہندی زبانیں بولی جاتی ہیں۔لیکن اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو تینوں خطوں میں بہ آسانی بولی جاتی ہے، سمجھی جاتی ہے اور لکھی جاتی ہے اور یہ تینوں خطوں میں رابطے کے لیے پُل کا کام دیتی ہے۔لیکن بدقسمتی سے یہ زبان آج برائے نام سرکاری زبان ہو کے رہ گئی ہے۔یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ اس میں ہماری (اردو والوں) کی بھی کچھ کمزوریاں اور نااہلی ہے۔اگر ہم اردو کے مواصلاتی نظام میں استعمال ہونے والی زبان کی موجودہ صورتِ کو دیکھ لیں گے تو یہ انتہائی تشویش ناک حد تک بازاری زبان ہو کے رہ گئی ہے۔جس میں ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات سرفہرست ہے۔آج ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی زبان میں ادبیت کا فقدان نظر آتا ہے۔پرانے زمانے میں کم پڑھے لکھے لوگ ریڈیو کی خبروں سے اپنے تلفظ اور لہجے کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے تھے۔اب صورتِ حال کافی بدل چکی ہے۔اب ان ذرائع وابلاغ سے نشر ہونے والی زبان کا معیار درمیانے درجے کے پڑھے لکھے فرد سے بھی کم تر ہے ۔انگریزی کے ایسے الفاظ کی بھر مار کی جاتی ہے جن کے اردو میں بہت ہی آسان مترادف الفاظ موجود اور رائج ہوتے ہیں۔اردو خبر نامہ کے دوران بولنے والے کچھ سوچے سمجھے بغیر زبان کی قینچی ایسے چلا رہے ہیں کہ اختتام تک یہ سمجھ نہیں آتا ہے کہ واقعی یہ اردو خبر نامہ تھا یا انگریزی۔یہی صورتِ حال ٹیلی ویژن کے اردو پروگراموں کا بھی ہے۔یہاں پیش کار کے تلفظ یا زبان کے دوسرے قواعد کے بجائے اس کی اداکاری کو اہمیت دی جاتی ہے۔پیش کار کے چہرے یا لب ورخسار پر غازہ دیکھائی دینا ضروری ہے۔جس کے نتیجے میں وہ پیش کار کے بجائے اداکار زیادہ دیکھائی دیتا ہے۔دراصل جب ایسے لوگوں کا تقرری عمل میں لائی جاتی ہے،تو اس وقت ان کو اردو زبان پر مہارت کے بجائے پیشکش پر زیادہ زور دیا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی زبان بھی بازاری زبان ظاہر ہوتی ہے۔دوسری طرف اگر ہم بی۔بی۔سی اردو کے نشریات یا پڑوسی ملک پاکستان میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے اردو نشریات کی بات کریں تو حقیقی معنوں میں ان کی نشریات میں ادبیت اور روانگی پائی جاتی ہے۔

یہی صورت حال اردو اخبارات ورسائل کا ہے۔غور کیجیے تو محسوس ہوگا کہ اردو والے انگریزی زبان کے الفاظ،اصطلاحات یا محاورے کو یوں قبول کر لیتے ہے جیسے یہ الہامی اور مقدس کلمات ہے۔سیکولر میڈیا کی وجہ سے اردو اخبارات میں بڑے بڑے بھاری بھرکم اور اوسط علمی استعداد فرد کے فہم سے بالا

تر انگریزی الفاظ بلا تکلف ٹھونسے جا رہے ہیں۔ انگریزی خبروں کے متن کا اردو ترجمہ کرتے وقت مترجم لمحہ بھر سوچنے کی زحمت نہیں کرتا اور آسان الفاظوں کا ترجمہ کر کے مشکل لفظوں کو جوں کا توں چھوڑ دیتا ہے۔ اگر کوئی لکھنے والا کسی مخصوص علاقے یا ملک کے حالات و واقعات کے بارے میں لکھیے تو حسب ضرورت کچھ علاقائی الفاظ یا اصطلاحیں بھی استعمال کرے گا لیکن ایسے الفاظوں کے برمحل استعمال سے اردو زبان کا اپنا حسن ختم ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی جاپان، چین یا روس کے مقامی زبانوں کے الفاظوں کا متبادل تلاش کرنے کے بجائے ہو بہو ویسا ہی لکھیے تو یہ اردو زبان کے ساتھ بالکل نا انصافی ہوگی۔ ستم یہ ہے کہ ان غیر ترجمہ شدہ الفاظ کو اردو رسم الخط کے بجائے رواں اردو جملے کے درمیان انگریزی حروف میں ہی لکھا جاتا ہے۔ یہ قباحت اخبارات، ٹی۔ وی اور ریڈیو کے اردو نشریات میں زیادہ نظر آتے ہے۔ میڈیا کی کوشش نوجوانوں کی سیاسی اور سماجی بیداری کی طرف لے جانا ہی نہیں ہے بلکہ ان کو ایک ادبی ماحول میں رنگنا ہے۔ آج ادبی اداروں اور انجمنوں کے برعکس میڈیا کا زبان کو تقویت بخشنے میں کافی اہم رول ثابت ہوتا ہے۔ آج خاندان کے افراد، اڑوس پڑوس یا گلی محلے میں غیر رسمی سماجی میل جول میں کمی کی وجہ سے اب لوگ زیادہ تر نئے ترسیل وابلاغیات سے اپنا زیادہ وقت صرف کرتے ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ بچے کی زبان ماں کے بجائے زرائع وابلاغ مثلاً ٹیلی ویژن، ریڈیو، انٹرنیٹ، ویڈیگیم اور کمپیوٹر کے زیر اثر پروان چڑھتی ہے۔ اب نئ نسل کے اکثر بچے اپنی ماں یا گھر کے دوسرے افراد سے کم اور ٹیلی ویژن، ریڈیو اور کمپیوٹر کے زریعے دیکھے جانے فلمی اور کارٹون کرداروں سے زیادہ الفاظ یا کم سے کم ان کی تلفظ اور لب ولہجہ اپنے ذہنوں میں ذخیرہ کرتے ہیں۔ لہذا ابلاغیات کی زبان بالکل سادہ، سلیس، رواں اور شگفتگی ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں فنی وادبی خوبیاں پائی جانی چاہیے اور اسے بیک وقت ایک ہی رسم الخط کی زینت بنانی چاہیے۔

موجودہ دور کو سوشل میڈیا کا دور کہا جاتا ہے انٹرنیٹ کے بڑھتے رجحانات زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتا ہے۔ اردو زبان وادب کو بھی انٹرنیٹ کی ویب سائٹوں جیسے فیس بک، واٹس ایپ ، ٹویٹر، انسٹا گرام اور دیگر سیکڑوں سوشل سائٹس نے ترقی کی بلندیوں سے ہمکنار کیا ہے۔ اخبارات و رسائل کتب ودستاویزات، خواہ قانونی ہو یا طبی، ناول ہو یا افسانہ، تحقیق ہو یا تنقید، نظم ہو یا نثر وغیرہ جو بھی ضروریات ہوں سب کی سب انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔ دوسری جانب اگر اس کے منفی پہلو کو غور سے دیکھیں تو ایسے بے شمار جعلی شعراء و ادیب سامنے آتے ہیں جن کا اردو زبان وادب کے ساتھ دور کا بھی کوئی وابستگی نہیں ہوتی ہے اور نا ہی ادبی حلقوں میں ان کا کوئی نام ہے۔ وہ نئ نسل کے نوجوانوں کے ذہنوں پر کافی منفی اثرات برپا کر رہے ہیں۔ نئ نسل کے نوجوان ان کی تحریروں کو اہل زبان کی تحریریں سمجھ کر استفادہ حاصل کر رہے ہے۔ دوسری جانب جو حقیقی معنوں میں اردو ادب کے اہل لسان ہے اور جو نئ نسل کے نوجوانوں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہو سکتے ہے وہ ایسے بے شمار جعلی تخلیق کاروں کی وجہ سے نظر انداز ہو رہے ہیں۔

اردو زبان کا رسم الخط کئی زبانوں کے الفاظ کا ایک خوش نما مرقع ہے۔ اس میں عربی اور فارسی زبان کے حروف پائے جاتے ہیں۔ اسی لیے اردو زبان کے رسم الخط کو خط نستعلیق کہا جاتا ہے۔ ان دو زبانوں کے علاوہ برصغیر کی مقامی بولیوں کے حروف مستعمل ہونے کی وجہ سے اردو رسم الخط کی ایک اپنی الگ انفرادیت اور پہچان ہے۔ اردو زبان کے رسم الخط میں چند حروف ایسے بھی ہے جس کا استعمال کرنے میں کافی نزاکت اور محتاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ جیسے ''ہ اور ھ''، ''ڈ اور ڑ''، ''ز اور ذ''، ''ی اور ے'' وغیرہ۔ جدید دور میں کمپیوٹر کے بڑھتے رجحان کی وجہ سے ان پیج کے زریعے لکھنے کا رواج کافی عام ہوا ہے۔ یہ اردو زبان کی ترویج کے لیے ایک خوش آئین بات ہے۔ لیکن کمپیوٹر کے تحت حروف (Key Board) پر انگلیاں چلانے والے جب دھڑا دھڑ اردو رسم الخط میں تحریریں لکھتے ہیں تو مذکورہ حروف تہجی کے صحیح استعمال کرنے میں غلطیاں کر جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''ہ'' ہائے ہوز اور ''ھ'' ہائے دوچشمی کو لکھتے وقت اکثر املا کی غلطیاں ہوتی رہتی ہے۔ جیسے بھاری سے بہاری، پہاڑ سے پھاڑ، دہرا سے دھرا، تھالی سے تہالی، کھرا سے کہرا وغیرہ۔ اسی طرح روڑ، توڑ، موڑ، ڈول، ڈکٹیٹر، ڈسنا اور ڈاک جیسے الفاظوں میں ڑ اور ڈ لکھتے وقت املا کی غلطیاں در پیش آتی ہے۔ اس کے علاوہ اردو زبان میں مستعمل مرکب حروف جیسے بھ پھ جھ لھ نھ وغیرہ کے صحیح استعمال کرنے میں کمپیوٹر کے تحت حروف کے زریعے املا کی غلطیاں ہوتی ہے۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کیونکہ بعض لوگ جن کو اردو زبان کے رسم الخط کے بارے میں شناسائی نہیں ہوتی ہے۔ وہ ''ہ'' اور ''ھ'' کو ایک دوسرے کا متبادل یا مترادف تصور کرتے ہے۔ اسی طرح مرکب حروف کو اردو رسم الخط میں غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مرکب حروف کے بغیر اردو زبان کا وجود ہی ناممکن ہے۔

کافی چھان بین کے بعد جو الفاظ میں نے غلط ہجوں اور شکلوں میں پائے ہیں ذیل میں چند مثالیں پیش کر رہا ہوں:

غلط الفاظ	صحیح الفاظ
اژدہام	ازدحام
حامی بھرنا	ہامی بھرنا
مواقوں	مواقع یا موقعوں
منگل وار کے دن	منگل کے دن
یہ بات وضع کرو	یہ حساب واضح کرو
رقیق	رکیک
سیب کا مربع	سیب کا مربّہ
نکتہ نظر	نقطہ نظر
اہم نقطہ	اہم نکتہ
اعلا	اعلیٰ
بلکل	بالکل
گذارش	گزارش
مسالہ	مصالحہ
کاغز	کاغذ

نذر	نظر
بین القوامی	بین الاقوامی

اس کے علاوہ جملوں میں تذکیر وتانیث یعنی مذکر ومونث کی غلطیاں بھی بہت عام ہیں۔ ذیل میں چند مثالیں پیش ہیں:

غلط جملے	صحیح جملے
ایسا موقعہ پھر نہیں ملے گا	ایسا موقع پھر نہیں ملے گا
آپ کا مذاج کیسا ہے؟	آپ کے مزاج کیسے ہیں؟
ہجوم نعرے لگا رہے ہیں	ہجوم نعرے لگا رہا ہیں
آج کی اخبار آ گئی	آج کا اخبار آ گیا
عوام جمہوریت چاہتی ہے	عوام جمہوریت چاہتے ہے
اس لفظ کی معنی کیا ہے؟	اس لفظ کے معنی کیا ہے؟
آپ کیا کہتے ہو؟	آپ کیا کہتے ہیں؟
مذید کیا کہتے ہیں	مزید کیا کہتے ہیں
ساری چیزیں اکھٹی کرلو	ساری چیزیں اکٹھی کرلو
انھوں نے کہا کے	انھوں نے کہا کہ
میں نے کہا تھا نہ کہ مت جانا	میں نے کہا تھا نا کہ مت جانا
دو کان سے سامان لے آؤ	دکان سے سامان لے آؤ
قیمتیں دن بدن بڑھ رہی ہیں	قیمتیں روز بروز بڑھ رہی ہیں

اہل علم خصوصاً ترسیل وابلاغیات (ریڈیو، ٹی۔وی، اخبارات و رسائل) اور سوشل میڈیا سے وابستہ لوگوں سے میری گزارش ہے کہ ان معروضات پر سنجیدگی سے غور کریں اور اردو املا کے نظام میں موجود ایک بہت بڑے علمی سقم اور مغالطے سے نکلنے کی کوشش کریں۔ یاد رکھے! دنیا کو کوئی ضرورت نہیں کہ ہماری زبان کو سنبھال کر رکھے۔ یہ ذمہ داری ہمیں خود اُٹھانی ہے، مجھے اردو زبان پیاری ہے تو مجھے اپنا پیار خود ہی ثابت کرنا ہے۔ وحشت صاحب نے اس بارے میں خوب کہا ہے۔

کس طرح حسن زبان کی ہو ترقی وحشتؔ
میں اگر خدمت اردوئے معلّیٰ نہ کروں

لہٰذا یہ سب اہل اردو زبان لوگوں پر فرض ہے کہ وہ نجی و اجتمائی سطح پر اس زبان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے اقدامات اُٹھائیں اور تمام ادبی اداروں اور انجمنوں کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اردو زبان کے درپیش مسائل دور کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ تاکہ ہماری اس پیاری، خوبصورت اور دلکش زبان کو کسی بھی صورت میں بازاری زبان نہ بنا دیں۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

''اردو کو لیڈروں کی نہیں مخلص کارکنوں کی ضرورت ہے۔'' ●●

کشمیر کے 'پریم چند' پریم ناتھ پردیسی کا افسانوی فن

ڈاکٹر محمد سلیمان

ریاست جموں وکشمیر میں اردو زبان کو ۱۸۸۹ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کے دور اقتدار میں سرکاری زبان کا رتبہ حاصل ہوتے ہی یہ زبان وہاں کے تہذیب وتمدن، ثقافت وادب کے قریب ہوگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کئی ادیب اس زبان کی وساطت سے اپنے خیالات کا اظہار پہلے شعری اور پھر نثری اصناف میں کرنے لگے۔ یوں جموں وکشمیر میں اردو ادب کا آغاز ہوا، اور تب سے لے کر آج تک ریاست کے کئی اُدباء اسی زبان میں مسلسل لکھ کر اردو ادب کی خدمت کرتے آرہے ہیں۔

جموں وکشمیر میں اردو افسانے کی شروعات ۱۹۳۱ء کے آس پاس ہوئی۔ اگرچہ یہ سوال ابھی بحث طلب ہے کہ ریاست میں اردو کا پہلا افسانہ نگار کون ہے جس میں محققین کی مختلف آراء ہیں۔ جہاں 'عبدالقادر سروری' پریم ناتھ پردیسی کو اردو کا پہلا افسانہ نگار خیال کرتے ہیں وہیں 'ڈاکٹر برج پریمی' نے منشی محمد دین فوق کو فوقیت دی، اور حامدی کاشمیری تیرتھ کاشمیری کو پہلا افسانہ نگار گردانتے ہیں لیکن یہ رائے سب کی یکساں ہے کہ فنی نقطۂ نظر سے پریم ناتھ پردیسی ہی جموں وکشمیر کے پہلے افسانہ نگار شمار کیے جاسکتے ہیں۔ اور انھوں نے ہی باقاعدہ طور پر یہاں اس صنفِ سخن کو نئی منزلوں سے ہمکنار کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ آپ کشمیری پنڈتوں کے سادھو خاندان سے تعلق رکھتے تھے آپ کا جنم ۱۹۰۹ء میں سرینگر کشمیر میں ہوا۔ ان کے تین افسانوی مجموعے 'شام وسحر' 'دنیا ہماری' اور 'بہتے چراغ' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔

پردیسی نے اگرچہ ۱۹۲۴ء سے ہی اپنے خیالات کو لفظوں کا جامہ پہنانا شروع کیا اور ابتدا میں شاعری کی طرف متوجہ ہو کر رونق تخلص اختیار کیا اور شعر کہنے لگے۔ لیکن بہت جلد آپ نے شاعری کو بالائے طاق رکھ کر ۱۹۳۲ء میں افسانہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا۔ موصوف نے حقیقت نگاری کے زیر اثر اپنے افسانوں میں سماجی، معاشی، گھریلو اور عام زندگی کے مسائل کو پیش کیا جس سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ پردیسی ترقی پسند تحریک سے متاثر تھے اس طرح ریاست میں پہلی بار کسی تحریک کے زیر اثر افسانے لکھنے کا عمل شروع ہوا۔ ان کے افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات جابجا نظر آتے ہیں۔ شروع شروع میں پردیسی ٹیگور کی پیروی کرتے ہوئے بے حد رومانی نثر لکھتے تھے ان کی کہانیوں پر ادب لطیف کا گمان ہوتا تھا۔ لیکن پریم چند کی سماجی حقیقت نگاری، انگارے کی اشاعت، استحصال قوتوں کی بے انصافی اور ریاکاری، ترقی پسند تحریک کے آغاز اور پھر کشمیر کے سیاسی حالات نے پریم ناتھ پردیسی کو پہلی بار احساس دلایا کہ انھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ ضائع کیا ہے۔ وقت کی آہٹ سن کر انھیں اپنی فرض ناشناسی کا اندازہ ہوا جس کا اعتراف موصوف خود ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۸ء تک جو کچھ میں نے لکھا اس پر میں فخر نہیں

9149580173

کر سکتا۔ کیوں کہ اس وقت تک مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے مجھ پر اپنے وطنِ عزیز کے کیا فرائض ہیں۔۔۔۔ یہ ایک ایسی تبدیلی تھی جس نے میرے سامنے نئی راہیں کھول دیں، بلکہ ہمارے ملک کے سامنے نیا نظریہ رکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ اب بھی اگر میں اس نظریہ کا ساتھ نہ دوں تو میری افسانہ نگاری بے کار ہے اور آنے والا مؤرخ مجھے کن ناموں سے یاد کرے گا۔۔۔مگر عوام کو اپنی کہانیوں سے غلامی، افلاس اور استحصال کا احساس دلا سکتا ہوں۔'' ۱

نئے شعور کے طلوع ہونے کے ساتھ پردیسی بھی رومانی انداز سے ہٹ کر کشمیر اور کشمیر کے محنت کش عوام اور خاص طور پر نچلے طبقے کے لوگوں کی ترجمانی کرنے لگے۔ یہ وہ دور تھا جب ڈوگرہ شاہی کے خلاف سیاسی رہنما عوام کے اندر بیداری، حوصلہ اور ہمت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی طاقت پیدا کر رہے تھے۔ جس کا اثر بلواسطہ طور پردیسی پر بھی پڑا اور وہ اسی صورت حال سے وابستہ موضوعات کو قلم بند کرنے لگے۔ اُن کا افسانوی مجموعہ ''بہتے چراغ'' اسی دور کے کشمیر کی عکاسی کرتا ہے۔ پروفیسر حامدی کاشمیری رقمطراز ہیں؛

''پردیسی کی نظر اردو افسانوی ادب اور اس کے اسالیب و موضوعات پر تھی۔ انہوں نے اپنے ذہنی رویے میں تبدیلی پیدا کی اور اہلِ کشمیر کے گھریلو، سماجی، سیاسی اور نفسیاتی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔'' ۲

ریاست جموں و کشمیر کے ابتدائی افسانوی دور کے دوران جہاں آزادی سے پہلے شمالی ہندوستان میں ۱۹۳۹ء کو ''حلقہء اربابِ ذوق'' کا وجود عمل میں آیا وہیں پردیسی نے بھی ایک وسیع تر ادبی دنیا میں آ کر اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ریاست میں ''حلقہء اربابِ ذوق'' کی ادبی انجمن تشکیل دی، لیکن اس انجمن کا لاہور میں بنی ہوئی ''حلقہء اربابِ ذوق'' کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ اسی زمانے میں اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ ''شام وسحر'' شائع ہوا۔ اس افسانوی مجموعے میں 'راجو کی ڈولی، پارسل، سنتوش، سلاخوں کے پیچھے، ماں کا پیار، جے کارا، سچا دوست وغیرہ افسانے شامل ہیں۔ اگرچہ پردیسی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہونے کی وجہ سے اس میں کہیں کہیں فنی اور ہیئتی خامیوں کے علاوہ رومان اور جذبات کی کثرت نظر آتی ہے پھر بھی یہ مجموعہ ریاست کے ابتدائی افسانوی سفر میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔

''حلقہء اربابِ ذوق'' کے کمزور پڑنے کے بعد پردیسی نے رامانند ساگر کے ساتھ مل کر ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کی ایک شاخ سرینگر میں کھولی، جس میں غیر ریاستی ادیب بھی شرکت کرنے لگے۔ جن میں راجندر سنگھ بیدی، بلراج ساہنی، خواجہ احمد عباس، دیوندر ستیارتھی بھی شامل تھے۔ جہاں ''حلقہء اربابِ ذوق'' کے دوران پردیسی نے اپنا پہلا افسانوی مجموعہ شائع کیا وہیں ''انجمن ترقی پسند مصنفین'' کے دور میں ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ''دنیا ہماری'' بھی منظر عام پر آیا۔ اس افسانوی مجموعہ کی کہانیاں پہلے مجموعے سے بالکل الگ تھیں۔ جہاں پہلے افسانوی مجموعے میں کہیں رومانیت کا عکس نظر آتا تھا تو کہیں ٹیگور کا رنگ جھلکتا تھا وہیں دوسرے افسانوی مجموعے میں تکنیک اور ہیئت کے اعتبار سے کافی زیب و زینت تھی۔ جسمیں نہ کوئی ہیجان اور نہ کوئی تلملاہٹ نظر آتی ہے۔ ''دنیا ہماری'' کے افسانوں میں اگرچہ موضوع جداگانہ ہیں لیکن جو چیز یکساں پائی جاتی ہے وہ ہے انسانی نفسیات کا ادراک۔ پردیسی کا اس مجموعے میں اندازِ بیاں بالکل سادہ اور رواں ہے جہاں وہ کم الفاظ میں اپنے مقصد کو فنی پیرائے میں برتنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں، وہیں پلاٹ، مقصد اور دلچسپی کے عناصر کو سمیٹ کر ایک نقطے پر لے آتے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی ان کے افسانوی مجموعے ''دنیا ہماری'' کے پیش لفظ میں یوں تجزیہ کرتے ہیں:

''اس مجموعے کی کہانیاں سادہ ہیں اور اپنی سادگی اور معصومیت کی بنا پر ہمیں ٹالسٹائی کی یاد دلاتی ہیں۔ ان میں نہ صرف عنصری عواطف اور نفسِ انسانی کی بنیادی کیفیات کی نقاب کشائی کی گئی ہے بلکہ تفسیر کے ساتھ تنقید کا پہلو بھی نمایاں ہے۔'' ۳

پردیسی نے اپنے افسانوں میں ریاست کی صحیح عکاسی کر کے کشمیر کو اصلی رنگ و روپ میں پیش کیا۔ وہ کشمیر کی خوبصورتی ہی نہیں بلکہ بدصورتی کو بھی منظر عام پر لاتے ہیں۔ وہ کشمیر کے تپتے ہوئے دوزخ کدوں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ غربت، بھوک، افلاس، پسماندگی، معاشی و اقتصادی بدحالی، بے کاری، بیگاری کی لعنت کو وہ اپنے افسانوں میں حقیقی طور پر پیش کرتے ہیں اور اس کے پیچھے چھپے وجوہات کی بھی کہیں دبے پاؤں تو کہیں کھلے عام نشاندہی کرتے ہیں۔ یہ عکاسی پردیسی کے قلم سے شروع ہوئی اور پھر ان کے بعد کئی کشمیری مصنفوں نے بھی یہ رجحان اپنایا جن میں پریم ناتھ در، برج پریمی، وریندر پٹواری قابل ذکر ہیں۔ پردیسی کے 'ٹیٹنہ بٹنی'، 'ان کوٹ'، 'اگلے سال' اور 'دیوتا' جیسے افسانے کشمیر کے اس صورت حال کی خوب عکاسی کرتے ہیں۔ پروفیسر حامدی کاشمیری رقمطراز ہیں:

''پردیسی نے کشمیریت کو داخلی سطح پر محسوس کر کے اس کی مصوری کی ہے۔ ان کے افسانوں کے کرداروں کے رویے، محسوسات اور عقائد پردیسی کی شخصیت کے مختلف پہلو کو روشن کرتے ہیں۔'' ۶

پردیسی کے افسانہ ''دھول'' سے ایک اقتباس:

''اُس نے کئی بار پس انداز کرنے کا مصمم ارادہ کیا۔ جوں ہی تھیلی میں تین روپے سے زیادہ اکنیاں اور دونیاں جمع ہوتیں' یک لخت اس کا خاوند بستر پر دراز ہو جاتا۔ دوا دارو کے لیے تھیلی بھی خالی ہو جاتی اور میر بحری کے مشہور سود خوار پنڈت سے بھی آٹھ دس روپے قرض پر لیے جاتے۔ ایسے موقعوں پر اس نے تھیلی کو کبھی نہیں چھپایا۔'' ۷

پردیسی نے جاگیر شاہی کی چکی پینے والے کشمیریوں کے رنج و غم اور جستجو و آرزو کی تصویر کشی کرتے ہوئے انسان کے ازلی نفسیاتی پیچ وخم، فریب شکستگی اور اجنبیت کی مصوری کی ہے ان کے یہاں انسان کشمیری بن کر ضرور سامنے آتا ہے جو کشمیری لب ولہجہ رکھتا ہے۔ اس کی وضع، لباس، نفسیات، عقائد، نظریات، اخلاقی اور مذہبی رجحانات کشمیری ہیں۔ وہ کشمیر کی تنگ و تاریخ گلی کوچوں میں زندگی کے دن گزارتا ہے۔ خداترسی، بھائی چارے، ایمانداری، بے ایمانی، غیرت، بزدلی، رواداری، ایثار، روحانیت اور وطنیت کے متنوع اور متضاد جذبات سے کشمیری نظر آتا ہے لیکن افسانہ کے اختتام پر محسوس ہوتا ہے کہ

یہ محض ایک کشمیری مزدور، کاری گر، کسان، مولوی صاحب، بانجھ یا بیوہ عورت کی کہانی نہیں بلکہ ہر انسان کی واردات ہے۔

پردیسی شعوری تجسس سے کسی کشمیری موضوع کا انتخاب نہیں کرتے بلکہ کشمیریت ان کے باطن سے نمود ہو کر ایک تخلیقی ہیولے میں تبدیل ہوتی ہے۔ کشمیر ان کے لئے دکھی، مظلوم اور پسماندہ انسانیت کی علامت ہے۔ اہلِ کشمیر صدیوں کی غلامی افلاس اور استحصال کے نتیجے میں احساسِ کمتری، کاہلی اور بے عملی کے شکار ہوئے ہیں لیکن ان کے اندر ایک انا پرست، خودمختار اور غصیل انسان زندہ ہے۔ پردیسی کے افسانوں میں کشمیر اور کشمیریت کے آثار جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں وادی کے آبشاروں، فلک بوس پہاڑوں، برف سے ڈھکی چوٹیوں، جھومتے ہوئے سفیدوں، چناروں، بیرونِ ریاست سے آنے والے سیاحوں، دیہاتی زندگی، کشمیری لباس اور رہن سہن کی حقیقی منظر کشی کرتا ہے۔ اگرچہ کرداروں کے نام فرضی ہیں لیکن جگہوں کے نام بالکل حقیقی ہیں۔ جیسے جھیلِ ڈل، نشاط باغ، ڈلگیٹ، گلمرگ، پری محل، بلوارڈ، گگری بل، لال چوک وغیرہ۔

"پری محل کی مہیب صورت پہاڑیوں کے پیچھے سے صبح کا مسکراتا سورج دو نیزے اوپر آ چکا تھا اور ابھی تک اسے اپنے ہونٹوں میں آنسوؤں کی نمی کا احساس ہو رہا تھا۔۔۔وہ ڈل کے پار بلواڈ کے اس طرف اپنی ماں کے ساتھ رہتی تھی ۔۔۔اس وقت اسے یہ معلوم نہ تھا کہ ڈل کا یہ پانی جس کا بہاو بہتے ہوئے بھی محسوس نہیں ہوتا اسے اس جھونپڑی سے کبھی جُدا کرے گا۔ ان دنوں وہ ہر صبح اپنی سہیلیوں کے ساتھ ان پہاڑیوں پر چڑھتی اور سوکھی لکڑیوں کا ایک ٹوکرا بھر لاتی۔
"

پردیسی نے اپنے آخری ادبی ایام میں اپنے افسانوں میں ہیئت اور تکنیک کے بہت سے تجربے کئے۔ انہوں نے ایسے افسانے بھی تخلیق کئے ہیں جن میں نثر اور نظم دونوں کا التزام ہے۔ کبھی طویل تو کہیں منی افسانے بھی تحریر کئے۔ وہ ایک ایسی کہانی کے حصہ بھی رہ چکے ہیں جو شروع تو کسی اور تخلیق کار نے کی لیکن مکمل پردیسی نے کی۔ "پربھات" نام سے شائع ہوئی ایک ایسی کہانی جس کا پہلا پارٹ رنبیر سنگھ نے تخلیق کیا اور دوسرا پارٹ پردیسی نے، لیکن کہانی پڑھ کر کہیں کسی پیوند کاری کا احساس نہیں ہوتا اور نہ ہی اس بات کا اندیشہ بھی ہوتا ہے کہ یہ دو افسانہ نگاروں کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

پردیسی کو اس بات کا بڑا دُکھ رہا کہ جو فنکار کشمیر کو اپنا موضوع بناتا ہے وہ بس یہاں کی خوبصورتی کی عکاسی کرتا ہے لیکن عوام کے دکھ درد کے قریب جانے سے شاید کتراتے ہیں۔ یہاں کے قدرتی مناظر ان کے لیے محرک کا سبب بنتے ہیں لیکن کشمیر کے باطن میں جھانک نہیں سکتے۔ کشمیر سے متعلق اکثر واقعات و منظر کشی میں صرف یہاں کے برفیلے کوہساروں، سبزہ زاروں، آبشاروں، جھیلوں باغوں کے خارجی حسن کی عکس بندی کی گئی ہے لیکن یہاں کی داخلی پیچیدگی، ستم رسیدہ عوام کے حالات، تضاد واسراریت اور مظلومیت کی طرف کم متوجہ ہوئے۔ وہ کشمیر کی عکاسی تو کرتے ہیں لیکن دیانت داری سے نہیں۔ ڈاکٹر برج پریمی پردیسی کی اس دِل شکنی کو یوں قلم بند کرتے یں:

"انہیں کرشن چندر، عزیز احمد اور ایسے بڑے فنکاروں سے ملامت تھا کہ جنہوں نے یہاں کی بدنصیب قوم کے ساتھ درد کا رشتہ پیدا نہیں کیا اور انکے غم کو ٹٹول کر نہیں دیکھا۔ یہ فرض خود انہوں نے انجام دیا۔" ۸

کشمیری پنڈتوں کی اردو ادب میں خدمات کے حوالے سے پریم ناتھ پردیسی کا نام قابل ذکر ہے۔ موصوف پہلے ایسے ادیب ہیں جنہوں نے کشمیر کے ظاہر و باطن دونوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی۔ وہ کشمیر کی حقیقی روح میں اُتر کر اپنے افسانے اس طرح بُننے لگے کہ خود کو مجسمۂ کشمیر بنا دیا جہاں سے وادی کا ہر راز نمودار ہوتا ہے۔ اسی لیے بعض ناقدین پردیسی کو کشمیر کا پریم چند بھی کہتے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ قمر رئیس، سید عاشور کاظمی، ترقی پسند ادب، پچاس سالہ سفر، ثمر آفسیٹ پریس، دہلی ۱۹۸۷ء ص ۲۲۷۔۲۲۶

۲۔ حامدی کاشمیری، "ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب"، گلشن پبلیشرز، سرینگر، ۱۹۹۱ء، صفہ ۸۱

۳۔ پریم ناتھ پردیسی "دنیا ہماری"، مکتبہ لال رُخ، سری نگر، ۱۹۴۹ء، صفہ ۹

۴۔ برج پریمی، "کشمیر کے مضامین"، دیپ پبلیکشرز، سرینگر، ۱۹۸۹ء، صفہ ۱۰۰

۵۔ برج پریمی، "جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو نما"، رچنا پبلی کیشنز، جموں، ۲۰۱۳ء، صفہ ۲۹

۶۔ حامدی کاشمیری، "ریاست جموں و کشمیر میں اردو ادب"، گلشن پبلیشرز، سرینگر، ۱۹۹۱ء، صفہ ۱۲۲

۷۔ سلیم سالک، "جموں و کشمیر کے منتخب اردو افسانے"، میزان پبلیشرز، سرینگر، ۲۰۱۱ء، صفہ ۲۷

۸۔ برج پریمی، "جموں و کشمیر میں اردو ادب کی نشو نما"، رچنا پبلی کیشنز، جموں، ۲۰۱۳ء، صفہ ۱۸۱ ●●

تفہیمات وترجیحات

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے مضامین کا مجموعہ

فرسودہ موضوعات، کہنہ لفظیات اور بوجھل ثقیل اصطلاحات کی وجہ سے تنقید ایک کلیشے میں قید ہو کر رہ گئی ہے۔ تکرار اور یکسانیت نے شاید قارئین کو تنقیدی تحریروں سے بیزار کر دیا ہے۔ ایسے میں نئے موضوعات اور نئے زاویوں کی جستجو یقیناً ایک دشوار عمل ہے۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کے مضامین کا مجموعہ ''تفہیمات وترجیحات'' کا اختصاص یہ ہے کہ اس سے تنقیدی تجسس، تازگی، تنوع اور بین علومی مطالعات کی ایک اچھی صورت سامنے آتی ہے. اس میں مختلف ادبی تصورات، تنقیدی میلانات اور رجحانات کے حوالے سے تحریریں شامل ہیں۔ اساطیر، جمالیات اور اسالیب کے علاوہ ان موضوعات کو بھی محور بنایا گیا جو عصر حاضر میں بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ 'تفہیمات وترجیحات' میں شامل تحریروں کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ ارتکاز، انہماک اور مراقباتی کیفیت میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں اعلیٰ تنقیدی بصیرت کا عکس بھی ہے اور مطالعاتی وسعت بھی۔ تفہیم و تجزیے میں بھی منطقی اور معروضی انداز اختیار کیا گیا ہے۔ ان مضامین سے فکر و نظر کے نئے دریچے کھلتے ہیں اور تفہیم و تعبیر کے در وا ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد اپنی ذہنی ساخت اور علمی بصیرت کے اعتبار سے ادبی دنیا میں ایک امتیاز رکھتے ہیں۔ برصغیر کے مقتدر رسائل و جرائد میں ان کی تحریریں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اساطیر اور جمالیات پر ان کی گہری نظر ہے۔ معاصر ادبی تحریکات و رجحانات سے بھی باخبر ہیں۔ عالمی ادبیات سے بھی ان کی گہری شناسائی ہے۔ 'ادب، اسطور اور آفاق'، 'اردو غزل کا عبوری دور'، 'ادب اور جمالیات'، 'مغیث الدین فریدی کا تخلیقی کینوس'، 'فن تضمین نگاری' وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں جن کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ دہلی یونیورسٹی سے فیض یافتہ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کو مقتدر اداروں اور اکادمیوں کی طرف سے اعلیٰ اعزازات بھی مل چکے ہیں۔ ستیہ وتی کالج دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے ان کی وابستگی ہے۔ اس وقت اردو قومی کونسل کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ●●

اس کتاب کی قیمت 130 روپئے ہیں۔

اگر آپ اس کتاب کی پرنٹڈ کاپی حاصل کرنا چاہتے ہیں تو رابطہ کریں:

Sale-cum-Exhibition Centre
West Block - 8, Wing - 7, R. K. Puram, New Delhi - 110066.
Telephone : (+91 - 11) 26109746, 26108159
Fax : (+91 - 11) 26108159

email: sales@ncpul.in, ncpulsaleunit@gmail.com

مولانا ابوالکلام آزاد کا تعلیمی رجحان

عبیدالرحمن

تعلیم حقیقتاً نور ہے۔تعلیم انسان کے عزت ووقار اور عظمت وشہرت کا ذریعہ ہے، انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ صرف تعلیم کے باعث حاصل ہے۔قرآن کی پہلی آیت تعلیم ہی کے متعلق نازل ہوئی ہے۔اسلام اور جہالت دو متضاد شئے ہیں جو کبھی بھی اور کسی صورت میں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔

عام اصطلاح میں علم کی دوقسمیں بتائی جاتی ہیں،ایک روحانی یا اخلاقی دوسری جدید یا عصری۔ ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی نے ان دونوں قسموں کی وضاحت بہت صاف لفظوں میں کی ہے:

''عام اصطلاح میں علم کی دوقسمیں بتائی جاتی ہیں ایک روحانی یا اخلاقی اور دوسری جدید یا عصری۔روحانی یا اخلاقی تعلیم سے مراد وہ دینی یا مذہبی تعلیم ہوتی ہے جو عموماً ہمارے دینی مدارس میں دی جاتی ہے اور جس کا اصل سر چشمہ الہامی تعلیم ہوتی ہے جس میں قرآن وسنت، تفاسیر وفقہ اور وہ تمام شرعی موضوعات شامل ہوتے ہیں جو ہماری مذہبی زندگی میں کام آتے ہیں لہذا ہمارے دینی مدارس میں اسی تعلیم کا بندوبست کیا جاتا ہے۔جب کہ عصری یا جدید تعلیم سے مراد ایسی مروجہ سیکولر تعلیم ہوتی ہے جو عصری تعلیم گاہوں جیسے اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں رائج ہوتی ہیں جس میں آرٹس، کامرس، سائنس،ٹکنالوجی اور دیگر اسٹریم اور ان کے مضامین وموضوعات کی تعلیم شامل ہوتی ہے''

جب ایک حقیقت پسند تاریخ نویس ہندوستان پر مسلمانوں کی حکمرانی کے ادوار کا تذکرہ کرتا ہے تو بہت سارے ایسے پہلو قاری کے سامنے پیش آجاتے ہیں۔جس کا اعتراف عام طور پر تعصب کی عینک لگانے والے کرنے سے کتراتے ہیں مثلاً محمد غوری نے ۱۱۹۲ء میں جب دہلی میں حکومت قائم کی اس وقت کے تعلیمی ادارے دوقسم کے ملتے ہیں ایک مکتب جو ابتدائی تعلیم کے لیے دوسرے مدرسے اعلیٰ تعلیم کے لیے۔اردو انسائکلو پیڈیا میں اس کی وضاحت یوں ملتی ہے:

''اس دور میں مسلمانوں کے قائم کیے ہوئے ادارے دوقسم کے تھے۔مکتب جو ابتدائی تعلیم کے لیے، مدرسے اعلیٰ تعلیم کے لیے۔ان اداروں میں جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا نصاب ہر جگہ یکساں نہیں تھا۔لیکن ہر مسلمان بچے کے لیے ضروری تھا کہ وہ کم ازکم مکتب میں شریک ہوکر اور قرآن کی اتنی آیتیں ضرور یاد کرلے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھ سکے۔مدرسوں کے نصاب میں حدیث ،فقہ،ادب ،منطق،فن عروضی وغیرہ شامل تھے۔بعض جگہ اعلیٰ تعلیم کے اداروں میں تاریخ، معاشیات، حساب، علم ہیئت اور طب وزراعت جیسے علوم بھی پڑھائے جاتے تھے''

مندرجہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان پر مسلمانوں کی حکمرانی کے دور میں صرف مذہبی تعلیم کا ہی رجحان نہیں تھا بلکہ اس وقت کے تعلیمی ادارے عصری تعلیم کے تقاضے سے ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔مذہبی تعلیم جیسے قرآن ،حدیث ،فقہ ،ادب اور منطق کے ساتھ ساتھ طب، علم ہیئت ،تاریخ، معاشیات، حساب جیسے عصری علوم سے بھی مزین تھے۔

مغل شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے زمانے سے ہندوستان میں تعلیم کا باقاعدہ اور مکمل نظام کا روشن باب شروع ہوتا ہے۔اس سلطنت میں پہلی مرتبہ بلا تفریق مذہب وملت ایک ساتھ تعلیم حاصل کرنے کا معقول انتظام تھا۔اکبر کا قائم کیا ہوا تعلیمی نظام جہانگیر وشاہجہاں کے عہد تک قائم رہا لیکن اورنگ زیب نے اس نظام تعلیم میں کافی تبدیلی کی، چونکہ ہندوستان کے اسلامی مدارس میں درس نظامیہ کا سلسلہ بہت دنوں سے چلا آرہا تھا اور عہد اکبری سے ہی اس نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔اورنگ زیب نے اس نصاب تعلیم اور نظام تعلیم پر اعتراضات کرتے ہوئے اپنے استاد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

''......مجھے تاریخ کی باقاعدہ تعلیم دے کر حکومتوں کے آغاز اور ان کی ترقی وتنزلی کے اسباب بتاتے......خیر دنیا کی تاریخ سے پوری اور گہری واقفیت تو درکنار آپ نے مجھے میرے آبا واجداد کے نام بھی پوری طرح نہیں بتائے......آپ نے میرے والد ماجد سے کہا کہ ہم نے اسے فلسفہ پڑھایا ہے یہ صحیح ہے کہ آپ نے کئی برس تک میرے دماغ کو ان فضول اور احمقانہ مسائل سے پریشان کیا جن کا زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں تھا......اس طرح آپ نے میری جوانی کا قیمتی زمانہ لفظوں کے سیکھنے کی خشک بے فائدہ اور لامتناہی کوشش میں ضائع کردیا۔''

مذکورہ بالا اقتباس سے آج کے دور کے درس نظامیہ کو دیکھتے ہوئے شہنشاہ اورنگ زیب کی باتوں سے متفق ہونا پڑتا ہے کیوں کہ اس وقت بھی درس نظامیہ اتنا ہی از کار رفتہ تھا جتنا کہ آج ہے۔اکیسویں صدی میں بھی اس نظام تعلیم میں خاطر خواہ تبدیلی نہیں ہوئی۔ایک طرف حکومت کے تعصب دوسری طرف خود مسلمانوں کی آرام طلبی نے اسے اپنے پرانے روش پر ہی چھوڑے رکھا۔

اورنگ زیب کے انتقال (۱۷۰۷ء) کے بعد مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوگیا تھا۔انگریزوں نے ہندوستان کی حکومت مسلمانوں سے عیاری ومکاری اور عاصبانہ طور پر حاصل کرنی شروع کردی تھی۔مسلمانوں کو ہی اپنا اصل دشمن تصور کرنے لگے تھے۔۱۸۳۵ء میں لارڈ میکالے نے ہندوستان میں جدید مغربی علوم وسائنس کا باقاعدہ آغاز کیا جس کا مقصد رنگ ونسل کے لحاظ سے ہندوستانی اور ذہن وفکر کے اعتبار سے انگریزی حکومت کا وفادار بنانا

تھا۔لیکن مسلمانوں کی اکثریت نے انگریزوں کی اس رائج تعلیم کو اپنے دین و مذہب کے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے ۱۸۳۵ء میں آٹھ ہزار علماء کے دستخط کے ساتھ عرضداشت پیش کرتے ہوئے سخت مخالفت کی تھی۔

۱۸۵۷ء کی عوامی بغاوت کی ناکامی کے بعد مسلمانوں میں سے دو اہم شخصیات سامنے آئیں، ایک مولانا محمد قاسم نانوتویؒ دوسری سر سید احمد خاںؒ کی۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ انگریزی تمدنی یلغار اور عیسائی مشنریوں کے حملوں سے بچانے کے لیے انہوں نے اسلام اور اسلامی تعلیم کے احیاء کے لیے دارالعلوم دیوبند کا قیام کیا۔مولانا ہندوستان میں مسلم نوجوانوں کی ایک تعلیم یافتہ نسل تیار کرنے کے حق میں تھے جو ٹھوس اسلامی فکر رکھے اور دین اس کے مزاج میں رچا بسا رہے۔ ۹/جنوری ۱۸۷۴ء کو دارالعلوم دیوبند کے جلسۂ تقسیم کے اسناد کے موقع پر جو تقریریں کیں اس سے صاف وضاحت ہوتی ہے کہ دینی نصاب کیسا ہونا چاہیے:

’’دارالعلوم کے نصاب میں دینی علوم کے ساتھ جو علوم عقلی و نقلی رکھے گئے ہیں تو اس کا مقصد ایک طرف تو یہ ہے کہ مسلمانوں کے وہ علوم جو حکومت کی بے توجہی سے زوال پذیر ہیں وہ محفوظ ہو جائیں اور دوسری طرف ان کے پڑھنے سے طلباء میں علوم جدیدہ حاصل کرنے کی استعداد اور صلاحیت پیدا ہو جائے......دارالعلوم دیوبند کے نصاب سے فارغ ہونے کے بعد اگر طلباء سرکاری مدارس میں جا کر علوم جدیدہ حاصل کریں تو ان کے کمال میں اس سے بہت اضافہ ہوگا۔‘‘

محسن اعظم سر سید احمد خاںؒ بالاکوٹ کی جنگ میں مسلمانوں کی ناکامی دیکھ چکے تھے۔انھیں یقین ہو چکا تھا کہ اب وقت مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ رہا ہے اور قوم کی اصلاح کے لیے ہندوستان سے باہر جانے کے ارادہ کو ترک کرتے ہوئے فوری طور پر دو اہم ترین تدبیریں کیں:

(۱) ایسے رسالے لکھنا جس سے مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کی غلط فہمیاں دور ہوں۔

(۲) عصری اور جدید انگریزی تعلیم کے حصول کے لیے تعلیمی اداروں اور تنظیموں کا انتظام جس سے کہ مسلمانوں کی تباہی اور زبوں حالی سے نجات دلایا جا سکے۔

ان دونوں حضرات کے علاوہ اور بھی بہت سارے مسلم رہنما پیش پیش رہے جیسے بدرالدین طیب جی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا نذیر احمد وغیرہ۔

بدرالدین طیب جی کا شمار ان اہم ترین معماروں میں ہوتا ہے جو مسلمانوں کی زبوں حالی اور تعلیمی پسماندگی کے خاتمے کے لیے زندگی بھر سرگرم عمل رہے۔وہ مسلمانوں کو تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاسی میدان میں لانے کے خواہاں تھے جب کہ سر سید صرف تعلیم ہی کی طرف توجہ مرکوز کرانا چاہتے تھے۔علامہ شبلی نعمانی قومی اور عوامی تعلیم کے زبردست حامی تھے۔وہ مسلمانوں کے اپنے تعلیمی ادارے دیکھنا چاہتے تھے جو قدیم و جدید دونوں طرز کی تعلیم سے آراستہ ہو۔مولانا الطاف حسین حالی اس وقت مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے ذہنی، فکری، عملی اور قلمی جہاد چھیڑ رکھا تھا۔وہ سر سید کی تعلیمی تحریک سے کئی قدم آگے تھے۔ان کی توجہ سر سید کی طرح صرف مسلم لڑکوں کی تعلیم پر مرکوز نہ تھی بلکہ عورتوں کی تعلیم منظّم طریقے سے کرنے میں پیش پیش رہے۔اس ضمن میں نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

’’ہندوستان میں تعلیم نسواں کے اسی طرح باقاعدہ پیش رو تھے جس طرح اردو کے پہلے باقاعدہ نقاد تھے۔‘‘

مسلمانوں کی خستہ حالی کے خاتمہ کے لیے جدید تعلیم کو اہم اور ضروری بتانے والوں میں مولوی نذیر احمد بھی تھے۔مولوی نذیر احمد مزاجاً اور طبعاً مذہبی ہونے کے باوجود انگریزی تعلیم اور عورتوں کی تعلیم سے مسلمانوں کو مزین کرنا چاہتے تھے۔عورتوں کی تعلیم کے تئیں ان کا خاص رجحان تھا، وہ کہتے تھے:

’’تم مجھے پڑھی لکھی ماں دو میں تمہیں ایک تعلیم یافتہ مہذب اور با عزت قوم دوں گا‘‘

جب مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے مختلف تحریکیں وجود میں آنا شروع ہوئیں اور ان کے نتائج بھی ظاہر ہونے شروع ہو گئے ایسے میں انگریزی حکومت مسلمانوں کی قومی جذبات اور عزائم کو دبانے کی ہر ممکنہ کوششیں کرنے لگے، ان کی پرانی کلیسائی پالیسی لڑاؤ اور حکومت کرو کے عزم میں تیزی آنے لگی۔اس افراتفری اور کشمکش کے ماحول میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیت رونما ہوئی۔

نام محی الدین، تاریخی نام فیروز بخت، لقب ابوالکلام اور آزاد تھا۔ان کی ولادت ۱۱/نومبر ۱۸۸۸ء میں مکہ مکرمہ (سعودی) میں ہوئی اور انتقال ۲۲/فروری ۱۹۵۸ء میں ہوا۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی ابتدائی تعلیم مذہبی تھی، انھوں نے اپنے والد ماجد سے تعلیم حاصل کی جن میں عربی، فارسی اور اردو کا خاص دخل رہا۔اس کے بعد فلسفہ اور ریاضی کی بھی تعلیم حاصل کی۔سر سید کی تعلیمی تحریک سے بے پناہ متاثر ہوئے اور ذاتی شوق کی بنا پر انگریزی اور مغربی تعلیم بھی حاصل کی۔دیگر علوم حاصل کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستان کی ترقی خاص کر مسلمانوں کی ترقی جدید سائنس کے علوم ہی سے ممکن ہے۔

مولانا آزاد نے بہت سے ممالک کا دورہ کیا اور وہاں کے مشہور و معروف مفکروں سے ملاقاتیں بھی کی۔مولانا کے سیاسی سوچ کو قومی تحریک میں بدلنے میں ان مفکروں کا بڑا ہاتھ رہا۔مولانا نے مسلم لیگ پارٹی کی سیاست کی تنقید بھی کی۔الہلال اور البلاغ نامی رسالے بھی نکالے۔۱۹۴۲ء میں ہندوستان چھوڑ دو تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا۔قومی مفادات کے سلسلہ میں زنداں کی صعوبتیں بھی اٹھائی۔جب ملک ۱۹۴۷ء میں آزاد ہوا تو مولانا کو ہی وزیر تعلیم بنایا گیا، مولانا اس عہدے پر انتقال تک فائز رہے۔

ہندوستان میں جب انگریزوں کی حکومت عروج پر تھی اور ان کا قائم کردہ تعلیمی نظام ہر جگہ رائج ہو چکا تھا اس وقت مسلمانوں میں تعلیم جیسی اکائی میں دین اور دنیا کو لے کر تفریق پیدا ہو چکی تھی۔انگریزوں کی نیت مسلمانوں کے

تیئں صاف نہ تھی۔ مولانا آزاد انگریزوں کی مکارانہ چال سے واقف تھے۔ تعلیم دو مختلف خانوں میں بٹ چکی تھی، اس وقت کے رائج تعلیم کی کمزوریوں اور خامیوں کو مولانا بخوبی سمجھتے تھے، مسلمانوں کے تعلیمی مستقبل کو لے کر بے چین تھے، انھوں نے ہندوستان کے مستقبل کا منصوبہ جو تحریک آزادی کے دوران بنایا تھا اس میں تعلیم کو بنیادی حیثیت دی تھی۔ تعلیم کے اسی بنیادی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے نسیم اعظمی لکھتے ہیں:

''ان کے خیال میں انگریزوں کے دور میں جو تعلیمی نظام رائج تھا اس کے اندر کوئی فلسفہ حیات نہیں تھا جس کے باعث اس نظام تعلیم کو متحرک اور فعال بنایا جا سکے۔ وہ ایک ایسے نظام تعلیم کے تشکیل و رواج کے حق میں تھے جو حرکاتی نوعیت کا ہو، تاکہ نئی نسل انسانی کی خوابیدہ صلاحیتیں ابھر کر اپنا جوہر دکھا سکیں اور نئی نسل میں حوصلہ مندی، جرات و بے باکی اور آزادانہ سوچ کو فروغ مل سکے۔ وہ آرٹ، سائنس، اور علم و حکمت کی عظیم قوتوں سے بنی نوع انسانی کو استفادہ پہنچانا چاہتے تھے۔ وہ سائنس کو ایک ایسی قوت سمجھتے تھے کہ جس سے اس درد و غم پر بھی دنیا کو جنت بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح فنون لطیفہ سے دنیا میں حسن و جمال میں اضافہ کرنے کے حق میں تھے۔ فنی پیشہ ورانہ اور اعلیٰ تعلیم سے بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود، طرز فکر اور معیار زندگی میں بہتری اور خوشحالی لانے کے خواہاں تھے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ مذہب کو سائنس کے ساتھ ساتھ ہماری عملی زندگی میں بھی مرکزی اہمیت ملنی چاہیے۔''

مولانا فن تعلیم و تربیت اور پورے تعلیمی نظام پر دانشورانہ نگاہ رکھتے تھے۔ ان کی تحریروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ صرف تعلیم کو محض دینی اور روحانی تربیت تک محدود نہیں رکھنا چاہتے تھے بلکہ تعلیم کو سائنس اور جدید ٹکنالوجی سے مزین کرنا چاہتے تھے۔ مولانا تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی زور دیتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ تعلیم صرف منظّم طریقے سے ہی نہیں بلکہ غیر منظّم طریقے سے بھی ہونی چاہیے۔

مولانا آزاد تعلیم کے نصاب میں مشرقی اور مغربی دونوں طرح کے مضامین کے خواہاں تھے۔ دقیانوسیت ان کے اندر بالکل نہ تھی۔ وہ تعلیمی نصاب کو ملک کے حالات اور وقت کے تقاضے کے مدنظر ردو بدل کرتے رہنے کے حق میں تھے۔ مولانا اپنے عہد کے رائج طریقہ تدریس سے نالاں تھے اور مانٹیسری طریقہ تدریس سے متفق تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ طریقہ تدریس اساتذہ کے بجائے طلباء پر مرکوز ہونا چاہیے۔ موصوف طریقہ تدریس کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''اساتذہ مخصوص گھنٹوں میں چند مخصوص مضامین کے عنوان کے متعلق درس دیتے ہیں اور اس بات کا بالکل خیال نہیں رکھتے کہ یہ درس بچوں کے رجحانات اور دلچسپی کے مطابق ہے یا نہیں۔''

''جو چیزیں حواس خمسہ کے سامنے آتی ہیں وہ اپنا عمل کر کے اس کے نتائج سے دماغ کو اطلاع دے دیتی ہیں۔ دماغ اگر ان نتائج کو سمجھ جاتا ہے تو فوراً اطلاعات کو اپنے خزانے یعنی حافظہ میں بھیج دیتا ہے۔ اگر شکوک پیدا ہوئے تو پھر کاوش و تلاش شروع ہو جاتی ہے۔''

اساتذہ کے تعلق سے مولانا کا خیال تھا کہ اساتذہ کو ذمہ دار، محنتی اور فرض شناس ہونا چاہیے۔ اسی طرح تعلیمی اداروں میں نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے جو سخت قوانین بنائے جاتے ہیں اس کے سخت مخالف تھے۔ وہ طلباء کی محدود آزادی چاہتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ اگر نصاب اور تدریس بچوں کے ذہن اور دلچسپیوں کے عین مطابق ہوگا تو نظم و ضبط کے مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے بحیثیت وزیر تعلیم ہندوستانی تعلیم کے شعبوں میں بہت تعاون کیا ہے جیسے:

۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی تعلیمی کمیشن (رادھا کرشنن کمیشن) کی تشکیل کی۔

۱۹۵۰ء میں آسی سی آر کا قیام کیا۔
۱۹۵۲ء میں ثانوی تعلیمی کمیشن (مدالیر کمیشن) کی تشکیل کی۔
۱۹۵۳ء میں سنگیت کلا اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا۔
۱۹۵۳ء میں اے آئی سی ٹی ای کا قیام کیا۔
۱۹۵۴ء میں ساہتیہ اکیڈمی اور للت کلا اکیڈمی کا قیام کیا۔
۱۹۵۶ء میں یو جی سی کا قیام کیا۔

وزیر تعلیم کی حیثیت سے پورے ملک میں مفت اور لازمی تعلیم کو شروع کرنے کی پہل کی۔

ان کے علاوہ اور بھی بہت سارے کارنامے ہیں جن کا احاطہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں اہل بصیرت ان سے واقف ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ان تھک کوششیں کی ہیں جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے تعلیمی میدان کی طرف راہ ہموار ہوئی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی ذہانت نے اردو ادب کو بیش بہا ذخیرہ عطا کیا ہے۔ انہوں نے کئی اصناف ادب پر طبع آزمائی کی ہے ہر ہر لمحہ میں ان کی تحریر میں ادبی چاشنی ملتی ہے۔ ان کا ایک عظیم کارنامہ ''ترجمان القران'' ہے جس کی بدولت وہ ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔ ●●

معاصر تنقیدی رویے

ابوالکلام قاسمی

صفحات: ۲۸۰

قیمت: ۱۲۵ روپئے

سنہ اشاعت: ۲۰۱۹

ناشر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان،

نئی دہلی

جن عظیم شخصیات کی بدولت اردو دنیا میں الہٰ آباد کی ادبی حیثیت کو مزید استحکام حاصل ہوا ان میں ایک نام پروفیسر علی احمد فاطمی کا بھی ہے۔

ان کی درج ذیل کتاب اہمیت کی حامل ہے:

سر سید اور ھم

علی احمد فاطمی

(9415306239)

انتساب الہٰ آباد یونیورسٹی کے وائس چانسلر، تاریخ کے بڑے اسکالر، مفکر، دانشور اور شاعر پروفیسر رتن لعل ہانگلو کے نام ہے۔

یہ کتاب

سر سید اور ہم

سر سید اور سیکولرزم

سر سید۔ ترقی پسند نقادوں کی نظر میں

سر سید۔ چند غیر مسلم دانشوروں کی نظر میں

عبدالحلیم شرر اور سر سید احمد خاں

حالی اور سر سید۔ قرب اور بعد کے درمیان

سر سید کے خطوط

سر سید پر چند نئی کتابیں

انٹرویو۔ پروفیسر رتن لعل ہانگلو

جیسے اہم عنوانات سے مزین ہے۔

ضخامت، قیمت ہے:

۱۵۲، ۲۰۰ روپئے ہے۔

عصری مسائل اور ابلیس کی مجلسِ شوریٰ: ایک تجزیہ

ڈاکٹر محمد نہال افروز

علامہ اقبالؔ بلا شبہ اقبال بلند شاعر تھے۔ان کی اقبالیت کا اندازہ ان کی شاعری کے مطالعے سے ہوتا ہے۔علامہ اقبالؔ نظر بیں شخصیت کے مالک تھے۔ان کی زیادہ تر شاعری آفاقیت کی متحمل ہے۔ان کی شاعری میں آفاقیت کے وہ تمام مخلوط عناصر موجود ہیں، جو اپنے حال کے ساتھ ساتھ ماضی اور مستقبل کے مسائل کو بھی اپنی گرفت میں جکڑے ہوئے رہتی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبالؔ کی معنویت جو کل تھی وہی آج ہے اور یہی کل بھی رہے گی۔دورِ حاضر میں علامہ اقبالؔ کی آفاقیت اور معنویت کے متعلق پروفیسر آل احمد سرور اپنے ایک مضمون ''اقبال کی معنویت'' میں لکھتے ہیں:

''اقبال کی عظمت اور ہمارے لیے معنویت کا راز یہ ہے کہ وہ حال کا ایک کربناک احساس رکھتے ہیں، آتش رفتہ کا سراغ بھی رکھتے ہیں اور کسی اور زمانے کا خواب بھی دیکھتے ہیں۔'' 1

اسی طرح اقبال کو ماضی، حال اور مستقبل کا شاعر تسلیم کرتے ہوئے پروفیسر علی احمد فاطمی اپنے ایک مضمون ''اقبال کی عصری معنویت'' میں رقم طراز ہیں:

''اقبال محض بیسویں صدی کے شاعر نہ تھے۔انسانیت کے متعلق ان کی فکرمندی اور کائنات کے حوالے سے ان کی خردمندی اکیسویں صدی میں بھی ان کی مثبت و مستحکم شناخت قائم کر رہی ہے کہ اقبال کی ضرورت کل کے مقابلے آج زیادہ ہے۔اس لیے کہ اقبال کی شاعری میں حیات کی سچائیاں بول رہی ہیں اور اقبال کی فکر میں کائنات کی صدیاں بولتی نظر آتی ہیں۔وہ فکر اور وہ شاعری جو انسانی سماج کے رگ و پے میں سمائی ہوئی ہے اور جو ہماری عالمی اور انسانی تہذیب کا حصہ ہے۔اس لیے یہ کہنا نہ کل غلط تھا اور نہ آج غلط ہے کہ اقبال عالمِ انسانیت کے شاعر ہیں۔'' 2

آج علامہ اقبالؔ کو وفات پائے تقریباً 81 برس ہو چکے ہیں اور ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' انھوں نے اپنے وفات کے دو سال قبل یعنی کہ 1936ء میں لکھی تھی۔تقریباً اسّی سال پہلے لکھی گئی یہ نظم عصر حاضر میں رونما ہونے والے تمام مسائل کو واضح طور پر نمایاں کرتے ہیں۔آج کے دور میں عصری مسائل کو سمجھنے کے لیے ''ابلیس کی مجلسِ شوریٰ'' کا مطالعہ بے حد سود مند ہے۔اس نظم میں بیان ہونے والے مسائل عین آج کے مسائل معلوم ہوتے ہیں۔

'مجلس شوریٰ' عربی زبان کا مرکب لفظ ہے اور اردو زبان میں اپنی اصل صورت اور اصل معنی میں استعمال ہوتا ہے، جس کے معنی اردو لغات میں مجلس مشاورات، مشورہ کرنے والی مجلس، وہ مجلس جس میں انتظام کے متعلق صلاح و مشورہ کیا جائے، وغیرہ درج ہیں۔

اس نظم میں یہ دکھایا گیا ہے کہ شیطانوں کا بادشاہ ابلیس ایک مجلس میں اپنے پانچ مشیروں سے خطاب کرتا ہے۔اس مجلس کی صدارت ابلیس کر رہا ہے۔اس لیے سب سے پہلے ابلیس ہی اپنے مشیروں کے درمیان مختصر سی تقریر کر کے یہ بتاتا ہے کہ کیسے میں نے فرنگیوں کو بادشاہت کا خواب دکھایا ہے۔سرمایہ داروں، مظلوموں اور غریبوں کو بہکایا ہے۔اس پر پانچوں مشیر اپنے آقا ابلیس کے سامنے اپنی اپنی رائے پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں ابھی انہیں اور بہکانا ہوگا اور بہکانے کے الگ الگ مشورے بھی دیتے ہیں۔اشعار ملاحظہ ہو۔

یہ عناصر کا پرانا کھیل! یہ دنیائے دوں!
ساکنانِ عرشِ اعظم کی تمنّاؤں کا خوں!

کون کر سکتا ہے اس کی آتش سوزاں کو سرد
جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں

ابلیس کہتا ہے کہ یہ دنیا ایک پرانا کھیل ہے جسے آگ، پانی، مٹی، ہوا وغیرہ سے بنایا گیا ہے۔اس دنیاوی کھیل کو میں نے اپنے ابلیسی چال سے برباد کر دیا ہے۔وہ کہتا ہے کہ فرنگیوں کو بادشاہت کا خواب میں نے ہی دکھایا تھا۔اس کے علاوہ لوگوں کے دل و دماغ میں جو دین داری کا بھوت سوار تھا اس کو میں نے ہی بہکا کر ان کے دل و دماغ سے نکال دیا ہے۔میں نے سرمایا داروں کو سرمایہ داری یا سرمایہ پرستی کا سبق سکھایا۔غریبوں کو دین کی طرف سے بہکا کر روزی روٹی میں اس قدر مشغول کر دیا کہ وہ راہِ حق سے بہت دور ہو گئے۔اس طرح سے پورے معاشرے میں فتنہ فساد جو میں نے قائم کر دیا ہے یہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے۔آگے ابلیس یہاں تک کہتا ہے کہ یہ جو سماجی نظام میں نے درہم برہم کیا ہے اس کو اس دنیا کا خالق یعنی دنیا کو بنانے والا بھی درست نہیں کر سکتا۔یہ دنیا جب وجود میں آئی تھی تو خالق کائنات نے ہم فرشتوں کی ہزاروں سال کی عبادات کو خاک میں ملا کر انسانوں کو ہم سے افضل اور اعلیٰ بنا دیا۔آخر آج انہیں بہکا کر، انسانوں کو فتنہ فساد میں پھنسا کر ہم نے ان سے اپنا انتقام لے لیا ہے۔

ابلیس کی تقریر کو سن کر وہاں پر موجود تمام مشیروں نے اپنی اپنی رائے دی اور انسانی معاشرے کو اور برباد کرنے کے نت نئے طریقے بھی بتائے۔پہلا مشیر کہتا ہے۔

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے! یہ ابلیسی نظام

پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و ملاّ ملوکیت کے بندے ہیں تمام

پہلا مشیر اپنے آقا ابلیس کی باتوں پر مہر لگاتے ہوئے کہتا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تو نے ایسا ابلیسی نظام قائم کیا ہے، جس سے عوام مذہب کو چھوڑ کر سرمایہ داروں کی غلام ہو گئی ہے اور ان کے آگے سجدہ کرتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔ یہ ابلیسی چال کا ہی نتیجہ ہے۔ جو لوگ کل تک مذہب پر کاربند تھے وہ آج سرمایہ داروں کے غلام بن گئے ہیں اور بادشاہی نظام پر بھروسہ کرنے لگے ہیں۔ ہم نے اہل مشرق کو ایسی افیون کھلا دی ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے غفلت میں پڑ گئے ہیں۔ اس پر ابلیس خوشی کا اظہار کرتا ہے کہ انہیں ہم نے ہی بہکایا ہے کہ جو لوگ اپنے کو صوفی اور ملاّ کہتے تھے وہ بھی آج ملوکیت کی گرفت میں آ گئے ہیں۔ پہلے مشیر کی باتیں سن کر دوسرا مشیر پہلے مشیر کی باتوں کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے کہ

خیر ہے کہ سلطانی جمہور کا غوغا کہ شر
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے باخبر!

مشیر کہتا ہے کہ دنیا میں یہ جو نئے نئے فتنے سر اٹھا رہے ہیں شاید اس کی تجھے خبر نہیں ہے۔ ذرا تو سوچ کر دیکھ یہ جو ہر طرف جمہوری نظام کا شور و غوغا ہے، کیا یہ ہمارے لیے پریشانی کی بات نہیں ہے؟ اس کے جواب میں پہلا مشیر کہتا ہے کہ میں ان باتوں سے باخبر ہوں، لیکن میری درون بینی کہتی ہے کہ جمہوریت کی آڑ میں بادشاہت کا ہی عمل دخل ہے۔ اس لیے جمہوریت سے خوزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ جمہوری نظام دراصل ہمارے ہی بنائے ہوئے ابلیسی نظام پر عمل کر رہی ہے۔ پھر اسے سمجھاتے ہوئیں کہتا ہے کہ کیا تم مغرب کی جمہوری نظام سے واقف نہیں ہو، جو اس جمہوری نظام سے گھبرا رہے ہو۔ شعر ملاحظہ

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر!

پہلے اور دوسرے مشیروں کی بحث سن کر تیسرا مشیر اپنی رائے پیش کرتا ہے۔ وہ مشہور جرمن سوشلسٹ کارل ہنرخ مارکس کے نظریات کو ابلیسی نظام کے لیے خطرہ بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ روحِ سلطانی یعنی ایک آدمی کی بادشاہت باقی رہے تو بے چینی کی کوئی بات نہیں ہے، لیکن کارل مارکس کے نظریے کی وجہ سے ملک کی عوام بیدار ہو گئی ہے۔ مزدور طبقہ سرمایہ داروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہی ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا فساد ہو سکتا ہے۔ مزدوروں نے تو سرمایہ داروں یعنی کہ اپنے ہی آقاؤں کے خیموں کی طنابیں توڑ دی ہیں۔ یہ ہمارے لیے اچھا نہیں ہو گا۔ اشعار ملاحظہ ہو

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب؟
اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب!

تیسرے مشیر کی بے چینی اور بے قراری کو دیکھتے ہوئے چوتھا مشیر مارکسی تحریک کے خلاف ہو رہے ردِ عمل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

توڑ اس کا رومۃُ الکبریٰ کے ایوانوں میں دیکھ
آلِ سیزر کو دِکھایا ہم نے پھر سیزر کا خواب

وہ کہتا ہے مطلب یہ کہ مارکسی یا اشترا کی نظام سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے اس کو روکنے اور ختم کرنے کے لیے ایک ایسے نظام کو قائم کر دیا ہے جو اشترا کی نظام کا راستہ ہی روک دیا ہے۔ ایک وقت تھا جب رومتہ الکبریٰ یعنی کہ عظیم رومن سلطنت قائم تھی، جس نے قدیم رومن ہیرو سیزر کی اولاد کو یعنی اہل رومن کو یہ خواب دکھایا تھا ہماری سلطنت ایک دن عروج حاصل کر لے گی اور پورے رومن پر ہماری سلطنت ہو گی۔ اسے بھی ہمارے قائم کردہ نظام نے توڑ دیا ہے۔

پہلے، دوسرے، تیسرے اور چوتھے مشیر کی بحث کو سن کر پانچواں مشیر ابلیس کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ

اے ترے سوزِ نفس سے کارِ عالَم اُستوار!
تو نے جب چاہا، کیا ہر پردگی کو آشکار

فتنۂ فردا کی ہیبت کا یہ عالم ہے کہ آج
کانپتے ہیں کوہسار و مرغزار و جوئبار

مرے آقا! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

پانچواں مشیر سب سے پہلے اپنے آقا یعنی کہ ابلیس کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد تمام مشیروں کے مذاکرات کا نچوڑ یعنی ماحصل پیان کرتا ہے۔ پھر وہ اپنی بات کہتا ہے کہ اس دنیا کا کاروبار تیرے ہے دم سے چل رہا ہے۔ اس کے بعد وہ اصل مدعا پر آتا ہے کہ بے شک فرنگی جادوگر تیرے مرید ہیں۔ مگر اب ان کی فہم و ادراک پر اعتبار نہیں رہا۔ اگر وہ اتنے ہی عقیل و فہیم ہوتے تو مارکسی شرارت کو سر نہ اٹھانے دیتے۔ آخر میں پانچواں مشیر یہ بھی کہتا ہے کہ مارکسی تحریک کی وجہ سے ہمارا ابلیسی نظام درہم برہم ہوتا ہوا نظر آ رہا ہے۔ ہمیں کوئی اور فتنہ پیدا کرنا چاہیے۔

پانچوں مشیروں کے باتیں سننے کے بعد ابلیس اپنے صدارتی خطبے میں کہتا ہے کہ مارکسی تحریک سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میری ایک ابلیس چال انہیں گمراہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ مجھے ڈر ہے تو صرف مسلمانوں سے۔ ان کے پاس ایک ایسی کتاب ہے، جس پر وہ عمل کرنے پر آ جائیں گے تو ہماری ایک بھی ابلیسی چال ہمارے کام نہ آئے گی، لیکن آگے ابلیس یہ بھی کہتا ہے کہ مسلمان اس کتاب پر عمل نہیں کر رہے ہیں۔ وہ مال و دولت کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ خانقاہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایسی حالت میں انہیں بہکاتے رہنا ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔

ابلیس کا یہ صدارتی خطبہ تین بند پر مشتمل ہے۔ پہلے بند میں ابلیس پانچویں مشیر کی باتوں کا جواب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابلیسی نظام کو پریشان شدہ انسانوں ، مزدوروں اور اشتراکیوں سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مجھے ڈر صرف مسلمانوں سے ہے۔ یہ ایسی قوم ہے جس کی خاکستر میں وہ انگاریں ہیں جو کبھی بھی شعلہ بن سکتے ہیں۔ امتِ محمدیہ میں آج بھی ایسے مجاہد ہیں جن کے اندر شب بیداری کبھی بھی زندہ ہوسکتی ہے۔ یہ ایسی قوم ہے، جو ہاری ہوئی بازی کو بھی جیت سکتی ہے۔ اگر یہ قوم بیدار ہوگئی تو اپنی شکست کو فوراً فتح میں تبدیل کردے گی۔ اسی لیے میں کہتا ہوں کہ اشتراکیت نہیں بلکہ اسلام ابلیسی نظام کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

دوسرے بند میں ابلیس اپنے مشیروں سے کہتا ہے کہ ہمیں معلوم ہے مسلمان قوم قرآنی تعلیمات پر عمل نہیں کررہی ہے۔ پھر بھی ہمیں ابلیسی نظام کو قائم کرنے کے لیے مسلمانوں کو ہی بہکانا ہوگا۔ شعر ملاحظہ ہو۔

جانتا ہوں میں یہ اُمت حاملِ قراں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں

ابلیس کہتا ہے کہ آج کا مسلمان پہلے جیسا مسلمان نہیں رہ گیا ہے۔ ایک وہ مسلمان تھے جو مال ودولت کے پیچھے نہیں بھاگتے تھے۔ مال و دولت تو ان کی ٹھوکروں میں رہتی تھی، لیکن آج کا مسلمان اسی مال ودولت کا پجاری بن گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے رہنماؤں میں رہنمائی باقی نہیں ہے۔ وہ خود مال ودولت کے چکر میں بے عمل ہوگئے ہیں۔ یہ قرآن سے بہت دور اور سرمایہ داروں کے بہت قریب ہوگئے ہیں۔ اب تو سرمایہ داری ہی مسلمانوں کا ددین بن گیا ہے۔ پھر بھی ابلیس کو یہ اندیشہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مسلمان قرآنی تعلیمات پر عمل کرنے لگیں اور ہمیں شکست کا سامنا کرنا پڑے۔ اس لیے وہ اپنے مشیروں سے کہتا ہے کہ مسلمانوں کو فقہی مسئلوں اور کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھائے رکھو، جس سے یہ اسلام کی سچی تعلیمات سے دور رہیں اور ان کے اندر صراطِ مستقیم پر چلنے کی صلاحیت پیدا نہ ہونے پائے۔

تیسرے بند میں ابلیس ان مسئلوں کو گنواتا ہے، جن میں الجھا مسلمانوں کو راہ حق سے دور کیا جاسکے۔ وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لیے طرح طرح کی باتیں اپنے مشیروں کو یاد دلاتا ہے۔ جیسے کہ حضرت عیسیٰ وفات پائے یا پھر انہیں زندہ ہی آسمان پر اٹھالیا گیا ہے۔ قرآن مجید الفاظ کے ساتھ نازل ہوا یا پھر زبانی۔ اس کے علاوہ ابلیس یہ بھی مشورہ دیتا ہے کہ مسلمانوں کو اس قدر ان چیزوں میں الجھا دو کہ وہ قرآن کی طرف مائل ہی نہ ہونے پائے۔ اشعار ملاحظہ ہو۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس اُمت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

مست رکھو ذکر و فکرِ صبح گاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

ابلیس کو یہ بھی ڈر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان قرآنی تعلیمات پر عمل کرنے لگے اور سارا ابلیسی نظام درہم برہم ہوجائے۔ اس لیے وہ کہتا ہے کہ میرے ساتھیوں مسلمانوں کو دنیاوی کاموں میں الجھا دو۔ انہیں ترک دنیا کا تعلیم دو۔ انہیں عبادات میں ایسا مصروف کردو کہ یہ دنیا کے فلاحی کاموں پر توجہ ہی نہ دے پائیں۔ انہیں خانقاہوں میں بانٹ دو یعنی کہ انہیں بے عمل کر بنا دو۔ انہیں ایسا کاہل اور سست بنادو کہ وہ صرف اپنی تقدیر پر ہی بھروسہ کر کے زندگی گزارتے رہیں۔

المختصر یہ کہ علامہ اقبالؔ کی اس نظم (ابلیس کی مجلس شوریٰ) میں زیر بحث آنے والے مسائل عین آج کے مسائل معلوم ہوتے ہیں۔ آج ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا میں مختلف مما لک اپنی حکومت بنانے کے لیے کیسے کیسے سیاسی کھیل کھلے رہے ہیں۔ کوئی بھی ملک آج کے دور میں سیاسی چال بازی، مکرو فریب اور فتنہ سے محفوظ نہیں ہے۔ یعنی کہ عصر حاضر میں دنیا کا ہر ملک ابلیسی نظام کی گرفت میں ہے، جس کے سبب تمام مما لک مختلف مسائل میں مبتلا ہیں۔

☆☆☆

حوالہ جات:

1۔ آل احمد سرور، دانشور اقبال، ایجو کیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، 2002، ص 139
2۔ علی احمد فاطمی، اقبال اور الہ آباد، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، 2015، 63 ●●

ایک لفظ کی موت

(صادق کی تجرباتی کہانیاں)

مصنف: پروفیسر صادق

ترتیب وتزئین: ڈاکٹر عشرت ناہید

9598987727

قیمت: ۵۰۰ روپے

PUBLISHER

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE,DELHI

011 23216162

اردو ادب کا شاید ہی کوئی قاری یا طالب علم ایسا ہو جو صادق کی شخصیت اور کارناموں سے متعارف نہ ہو۔ پروفیسر صادق کئی معنوں میں متنوع صفات کی حامل شخصیت ہیں۔ وہ بیک وقت اردو اور ہندی کے مقبول شاعر، نقاد اور مزاح نگار ہیں۔ اس کے علاوہ ڈراما نویسی اور فنِ مصوری میں بھی انھیں کمال کا جوہر حاصل ہے۔ صادق کو زبان، علم، فن، ادب اور آرٹ پر کامل عبور ہے۔ اتنا ہی نہیں موصوف برسوں تک ملک کی کئی بڑی تعلیمی دانش گاہوں میں درس و تدریس کے فرائض انجام دے چکے ہیں جس میں دہلی یونی ورسٹی بھی قابل ذکر ہے۔ انھوں نے جس طرح ایک قلم کار کی حیثیت سے اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اپنے تخلیقی اظہار اور فنی جوہر کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اسی طرح ایک استاد کے بطور بھی انھوں نے اپنے فرائض احسن طریقے سے نبھائے ہیں۔ صادق کی اردو میں اب تک پچیس کے قریب کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو مختلف النوع موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ اردو کا کوئی اہم موضوع ان سے اچھوتا نہیں رہا۔ انھوں نے شاعری (غزل، نظم)، پیروڈی، مزاح، تحقیق، تنقید، ڈراما اور افسانہ وغیرہ میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ علاوہ ازیں پرفیسر موصوف اردو زبان کے تعلق سے کئی ڈاکومینٹری فلمیں بھی بنا چکے ہیں۔ اردو، ہندی، فارسی، مراٹھی، سنسکرت، سندھی، پنجابی اور سرائیکی زبانوں کے سیمیناروں میں انھوں نے کئی لیکچر دیے ہیں۔ صادق مذکورہ زبانوں کے ادب سے خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں جس کی جھلک ان کی تخلیقات میں بھی صاف نظر آتی ہے۔ خصوصاً ہندی، فارسی اور سنسکرت الفاظ کی آویزش و آمیزش سے ان کی تحریریں معنی آفرینی سے لبریز ہیں۔ اعزازات و انعامات کی کبھی انھوں نے پرواہ کی اور نہ ہی کبھی اس کی چاہ رکھی بلکہ ہمیشہ ہمہ تن مخلصی کے ساتھ اردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔ مجموعی طور پر صادق کی ادبی خدمات قابلِ قدر ہیں جس پر جتنی خامہ فرسائی کی جائے کم ہے۔

نئی نسل کے ہونہار ادیب، مدیر اور ناقد **غلام نبی کمار** کے مضمون 'صادق کے تجرباتی افسانے' سے ماخوذ

7053562468,kumarnabi.gnk@gmail.com

جموں و کشمیر کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں علاقائی عناصر

لیاقت علی

BRANDER MOTHEWS نے لکھا ہے:

''مختصر افسانہ ان کہانیوں سے بالکل مختلف اور امتیازی صنف ہے جو اتفاق سے کہانی ہونے کے علاوہ مختصر بھی ہوتی ہے یہ کہانی کی ایک واضح فنی صورت ہے اور ایجاز و اختصار، جدت، فنی حسن اور تخیل کی چاشنی اس کی امتیازی خصوصیات ہیں''۔ یہی امتیازی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اب سے تقریباً ایک صدی پہلے یا اس سے بھی پہلے 1842ء میں (ELLEN EDGER POE) نے اپنے ایک ساتھی ہاتھورن (HATHORNE) کی کہانیوں کا تعارف اس طرح کروایا تھا ''ایک چابکدست فنکار نے ایک کہانی لکھی ہے ۔اس نے بڑے احتیاط اور غور و فکر کے بعد یہ طے کیا کہ وہ اپنے قاری کے ذہن پر کون سا واحد تاثر قائم کرنا چاہتا ہے اس واحد تاثر کو مدِ نظر رکھ کر وہ ایسے واقعات مہیا کرتا ہے۔ جن سے یہ مقصود تاثر پیدا ہو سکے اس کی پوری کہانی میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں۔ جس کا مقصد بلا واسطہ یا بالواسطہ اس مخصوص تاثر کا پیدا کرنا ہو''[۱]

اردو ادب میں لفظ ''دیہہ'' کی جمع ''دیہات ہے''۔ جس کے معنی بہت سارے ملے جلے گاؤں یا غیر شہری علاقے کے ہوتے ہیں۔ اردو میں دیہات کی اصطلاح انگریزی کے لفظ village or boondocks استعمال ہوتی ہے۔ لغت کے اعتبار سے دیہات کسی خاص علاقے یا ریاست کے ایسے خطے کو کہا جاتا ہے۔ جس کی اپنی کچھ خاص خوبیاں اور انفرادیات ہوتی ہیں، جو زبان، تہذیب اور رسم و رواج سے تعلق رکھتی ہیں۔ عام بول چال کی زبان میں دیہات کو اس علاقے سے منسلک کیا جاتا ہے۔ جہاں مشترکہ خاندانوں کی روایت ہو۔ دیہات کو کسی جغرافیائی یا لسانی اعتبار سے نہیں پرکھا جاتا، بلکہ ثقافتی، تہذیبی، سماجی رسوم و رواج، عادات و اطوار اور عقائد و رجحانات وغیرہ سے پہچانا جاتا ہے۔ عام طور پر دیہات کو پہاڑ کے ان دامنوں سے جوڑا جاتا ہے جو صوبہ بہار، بنگال، اتر پردیش اور جموں و کشمیر وغیرہ میں پائے جاتے ہیں۔

جموں و کشمیر میں دیہات سے متعلق اردو افسانہ نگاری کی بات کی جائے تو اس صنف کا آغاز بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے ہوتا ہے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق ریاست کا پہلا افسانہ نگار پریم ناتھ پردیسی کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ پردیسی نے اپنی قلمی زندگی کا آغاز تب شروع کیا تھا، جب ۱۹۲۴ء میں ریاست کا پہلا اخبار ''رنبیر'' لالہ ملک راج کی صدارت میں شائع ہوا۔ اس اخبار کے بینر تلے باقی قلمکاروں کے ساتھ پردیسی کو بھی اپنی صلاحتوں کو ابھارنے کا موقع ملا۔ (اس دور کی زیادہ تر ادبی محفلوں میں پریم چند، اقبال، ٹیگور اور چکبست کی کہانیوں کو پڑھا جاتا تھا)۔ اسی فضا میں پردیسی کا ذہن بھی پروان چڑھا اور ادبِ لطیف اور نثری شاعری کے ادب پارے تخلیق کرنے لگے۔ لیکن پردیسی کے ذہن کو ''انگارے'' اور پریم چند کے ''کفن'' کی اشاعت نے اتنا متاثر کیا کہ ان کے ذہن نے مکمل طور پر شاعری سے افسانہ کی طرف کروٹ لے لی۔

پردیسی کے بعد ریاست میں افسانہ نگاروں کا ایک ہجوم سامنے آتا ہے، جن میں پریم ناتھ در، دینا ناتھ وار یکو، تیرتھ کاشمیری، شیام لال ایمہ، نند لال بے غرض، دینا ناتھ دلگیر، اسیر کاشمیری، کوثر سیمابی، کیف اسرائیلی، محمود ہاشمی، دیا کرشن گردش، عجوبہ یاسمین، صاحب زادہ محمد عمر، کاشی ناتھ کنول، اور غلام حیدر چشتی وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ اس کے بعد راما نند ساگر، قدرت اللہ شہاب، نرسنگھ داس نرگس، کرشن چندر اور کشمیری لال ذاکر وغیرہ کا شمار بھی اسی دور کے قلمکاروں میں ہوتا ہے۔

۱۹۴۷ء کے بعد ریاست میں اردو افسانہ اپنے کئی زینے طے کر کے آگے بڑھا ہے، نہ صرف موضوع کے اعتبار سے بلکہ فن تکنیک اور تکنیک کے برتاؤ کے اعتبار سے بھی افسانے نے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ اس دور کے نامور افسانہ نگاروں میں ٹھاکر پونچھی، موہن یاورا اور کرشن چندر کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ ۴۷ء کے بعد لکھنے والوں کا کارواں مسلسل بڑھتا گیا اور نئے نئے تخلیق کار سامنے آتے گئے۔ جن میں آزادی کے بعد دیہات کے مسائل کو بروئے کار لانے والوں میں نور شاہ، عمر مجید، بلراج بخشی، شبنم قیوم، اور مشتاق احمد وانی کیتی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ وہ تخلیقار ہیں جنھوں نے اپنی کہانیوں میں نئے تقاضوں کی ترجمانی کی۔

پریم ناتھ پردیسی:

پریم ناتھ پردیسی کو ریاست جموں و کشمیر کے پہلے افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہے۔ پردیسی نے بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے لکھنا شروع کیا تھا۔ ان کی کہانیاں رنبیر، رتن، وتستا، ہمدرد وغیرہ جیسے اخبارات اور لاہور کے مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتی تھیں۔ پردیسی جب فرضی اور تصوراتی افسانوں کی تخلیق سے تائب ہو گئے تو مشہور افسانہ نگار صدیقہ بیگم سیوہاروی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۸ء تک جو کچھ میں نے لکھا اس پر میں فخر نہیں کر سکتا اس وقت تک مجھے احساس نہیں تھا کہ ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے مجھ پر وطن عزیز کے کیا فرائض ہیں اس وطن کے جس کے چالیس لاکھ باشندے پونے سو سال سے غلام در غلام چلے آ رہے ہیں۔ جس کی جڑیں افلاس اور لوٹ کھسوٹ سے کھوکھلی ہو چکی

ہیں''۔۲
اگر دیکھا جائے تو پردیسی کے کم و بیش تمام افسانے کشمیر مرکز (kashmir centred) افسانے ہیں۔اس پر سہل عظیم آبادی لکھتے ہیں: ''پردیسی کی زندگی کشمیر کے لیے تھی،ان کا فن کشمیر کے لیے تھا''۔

انہوں نے خاص طور پر اپنے افسانوں میں اہلِ کشمیر کی مجبوریوں، افلاس زدہ اور نچلے طبقہ کے مسائل کو سامنے لایا ہے۔ان کی افسانہ نگاری کے متعلق برج پریمی لکھتے ہیں:

''پریم ناتھ پردیسی کی ادبی زندگی کا سفر اس وقت شروع ہوتا ہے، جب ریاستی عوام مطلق العنانیت کی آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے مطلق العنانیت اور جاگیرشاہی کی چکی میں پسنے والے کشمیریوں کی درد و داغ اور جستجو آرزو کی تصویر کشی کرتے ہوئے تخلیقی اعتبار سے اس ازلی انسان کے نفسیاتی پیچ وخم، جمالیاتی سحر کاری، فریب شکستگی اور اجنبیت کی مصوری کی ہے، جو علاقائیت رنگ و نسل، مذہب اور جغرافیائی حد بندیوں کی نفی کرتی ہے''۔(۲)

دراصل پردیسی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''شام وسحر'' رومان کی حسین وجمیل وادیوں پر مشتمل ہے۔لیکن بہت جلد انہوں نے خوابوں کی اس حسین وجمیل دنیا کو خیر باد کہہ کر حقیقت کے درپیش مسائل کے تئیں اپنی آگہی پیش کرنے کو ترجیح دی۔اور آہستہ آہستہ ''بہتے چراغ'' اور ''کیچڑ کا دیوتا'' کی طرف لوٹ کر کشمیر کی آرزومندیوں اور ان کی جدوجہد کو پیش کیا ہے۔جس کی ایک عمدہ مثال افسانہ ''کیچڑ کا دیوتا'' سے ملتی ہے۔جس میں سفرو، مسمو اور کاہنا تین اہم کردار ہیں۔یہ تینوں جموں کی ایک فیکٹری میں مزدوری کرتے ہیں۔اور وہیں فیکٹری کے احاطے میں اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتے ہیں۔پیش ہے ''کیچڑ کا دیوتا'' کا ایک سین

مالک: کل رات نو بجے تو کہاں تھا؟ مسمو: (ڈرتے ہوئے) پکہ ڈنگہ گیا تھا
مالک: وہاں پکوڑے کھا رہا تھا ،مسمو: جی
مالک: اور مالن سے ٹھٹھا بھی کر رہا تھا...خاموش کیوں ہو۔تم نے شراب بھی پی تھی۔مسمو خاموشی اختیار کرتا ہے اور مالک اس کے منہ پر طمانچے اور مکیمار نے لگتا ہے۔مالک: بول حرام زادے تو نے شراب پی لی تھی۔

اتنے میں نندی مسمو کی بیوی جس کا پیٹ پھولا ہوا ہے جسے موٹے کھدر کا کرتا مشکل سے چھپا سکا تھا بچوں سمیت نمودار ہوتی ہے۔
نندی: اب دیا کرو بابو جی.....بھگوان سوگندھ اب نہیں پیے گا۔
وہ منت سماجت کر کے مسمو کو لے جاتی ہے۔اب مسمو، سفرو اور کاہنا نندی کے سامنے بیٹھے ہیں۔مسمو: کل بڑے دنوں بعد پی تھی کل ہی دنگا ہو گیا۔کاہنا: پھر بھی بڑے صاحب نے....سفرو: (بات کاٹتے ہوئے) بڑے صاحب نے تو خوب پٹائی کی
نندی: بڑا صاحب...رام قسم وہ خود پیتا ہے اور مزے کرتا ہے...یقین نہ ہو تو جا کر پوچھو....اس کے گھر میں کام کرنے والی سے:''۳
نور شاہ:

ریاست جموں و کشمیر سے بلا واسطہ اور بلواسطہ تعلق رکھنے والے شاعروں، افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نگاروں کے ایک بڑے کارواں میں ایک اہم نام نور شاہ کا بھی ہے۔نور شاہ اس شیریں زبان کی ترقی و ترویج اور اس کی آبیاری کرنے میں دن رات محنت کر رہے ہیں۔نور شاہ محض ایک افسانہ نگار ہی نہیں ایک اچھے ڈرامہ نگار اور دانشور بھی ہیں۔وہ آج اسی مقام کے عین مستحق ہیں جس پر سب سے پہلے کھڑے ہو کر عبدلقادر سروری نے ریاست میں مستقل رہنے والے قلمکاروں پر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔سروری نے بڑی دقیقہ شناسی کے ساتھ اس موضوع پر قلم اٹھا کر ''کشمیر میں اردو'' جیسی بے مثال کتاب کا نمونہ پیش کیا تھا۔

نور شاہ کے کئی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں جن میں ''بے گھاٹ کی ناؤ''، ''ویرانے کے پھول''، ''ماں کا آنگن اداس اداس''، ''ایک رات کی ملکہ''، ''گیلے پتھروں کی مہک اور ''بے ثمر سچ'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ویسے تو نور شاہ کا انداز رومانوی ہے یعنی وہ سجاد حیدر یلدرم ، نیاز فتح پوری اور مجنوں گورکھپور کسی حد تک متاثر ہیں، لیکن ان کے یہاں عشق کی جولانیوں اور ہجر کی کسک کے ساتھ ساتھ کشمیر کے دلفریب مناظر اور درد و آہٹ بھی موجود ہے۔نور شاہ کی پہچان اور ان کی شہرت وادی کی خوبصورتی وہاں کے علاقائی اور دیہی مسائل کے عکاس کی حیثیت سے ہے۔

عبدالقادر سروری نے نور شاہ کے بابت لکھا ہے:

''نور شاہ وادی کے افسانہ نگاروں میں غالباً سب سے زیادہ لکھنے والے افسانہ نگار ہیں........کہانی لکھنے میں نہ صرف انھیں ذوق ہے، بلکہ سلیقہ اور اچھا سلیقہ ہے ایک اچھے افسانہ نگار کی طرح وہ ہر موضوع سے ایک موثر افسانہ اور ہر موقف سے دلچسپ مرقع پیدا کر سکتے ہیں جہاں ان کے موضوع میں دم نہیں ،اسے بھی اپنے انداز اور فنی چابکدستی سے وہ جیتا جاگتا بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔سینکڑوں کردار انہوں نے پیدا کیے ہیں، تاہم ان میں یکسانیت بہت کم ہے، وہ حقائق کے افسانے لکھتے ہیں لیکن رومانی حقائق کے.....نور شاہ کرداروں کی بیرونی رنگ کاری کے علاوہ اکثر ان کے بطون کی گہرائیوں میں بھی جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں...افسانوں میں ڈرامائی موقف پیدا کرنے کی وہ شعوری کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔''۴

نور شاہ کے دیہی افسانوں میں ''بٹوت کی ایک رات''، خوشبو کا سفر''، صلیب''، ''اندھیرے اجالے''، بے جڑ پودے''، آسمان پھول اور لہو، زعفران کی لالی، علیا اور بلبل اور گل خان وغیرہ اہم ہیں۔حالات کی تغیر پزیری کے ساتھ ساتھ نور شاہ کے تخلیقی زاویوں میں بھی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں۔نور شاہ کی رومانیت پسندی کو کشمیر کی خون ریزی، آبرو ریزی اور دہشت گردی نے بہت جلد حقیقت پسندی کی طرف راغب کیا۔ان حالات پر لکھے افسانوں میں ''کرب ریزے''، ''سوداگر''، ''کوئی رونے والا نہیں'' اور ''دل ویراں میں کیا غم'' وغیرہ اہم ہیں۔مثال کے لیے پیش ہے ''خواب بھی بکتے ہیں'' کا اقتباس:

''اس دوران یہ جنت دھیرے دھیرے آہستہ آہستہ رُک رُک کر ایک نیا روپ اختیار کر گئی...جہنم کا روپ....آگ شعلے،قتل و اغارت آبرو ریزی،نا انصافی....اور پھر ایک عجیب سی بات ہوئی۔لگا تار بہت سے نوجوان لا پتہ ہو گئے۔بسیار تلاش کے بعد ان کی کوئی جانکاری نہ ملی۔پھر ایک ہنگامہ ہوا لوگ متحرک ہو گئے اور حراستی ہلاکتوں کے خلاف سڑکوں پر آ گئے۔تلاش شروع ....ہوئی۔کئی بے نام قبروں کی نشاندہی کی گئی اور کئی مسخ شدہ بے نام لاشیں ان قبروں سے برآمد کی گئیں''۔۶

ایک افسانے میں لکھتے ہیں:

''ہاں یہ بات تو صحیح ہے کہ لڑکی نے دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا،یا یوں کہیے کے خودکشی کر لی،مگر....مگر کیا ڈاکٹر خان؟'' یہ زخم اس بات کے گواہ ہیں کہ لڑکی نے بڑی جدو جہد کی ہے۔'' ،''اپنی زندگی بچانے کے لیے''۔نہیں ڈاکٹر اسلم اپنی آبرو بچانے کے لیے...... '' it is a case of gang rape'' ۷

خالد حسین:

خالد حسین جموں و کشمیر کے وہ تخلیقار ہیں جنھوں نے نہ صرف علاقائی حسن بلکہ ملک کے سماجی اور معاشرتی مسائل کو بھی پیش کیا ہے۔یہ مسائل خواہ سیاسی رہنماہوں کی غریب عوام کے ساتھ بدسلوکی کے ہوں یا افسروں کی بدعنوانیاں یا پھر تاجروں کی خود غرضیاں ہوں، سب کو موضوع بنایا ہے۔خالد حسین نے جب لکھنا شروع کیا تو ان کے سامنے ریاست کے پسماندہ، نچلے اور دیہی علاقوں کے کئی مسائل گردش کر رہے تھے۔افسانہ نگار نور شاہ،خالد حسین کے بابت لکھتے ہیں:

''خالد حسین اپنی کہانیوں کا مواد زمین کی کھردری سطح اور ارد گرد کے ماحول سے کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں جہاں حسن و کمال اور پیار و محبت کی نزاکتیں ملتی ہیں، وہیں موجودہ پر آشوب دور کی تصویریں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔یہ تصویریں بدصورت ہیں لیکن خالد حسین اس بدصورتی کو خوبصورتی میں تبدیل کرنے کے خواہاں ہیں۔وہ ان تصویروں کے ذریعے امن اور سلامتی سے بھرپور زندگی کا احساس دلانا چاہتا ہے اور ایک نئی فضا قائم کرنا چاہتا ہے''۔(۱۰)

خالد حسین حقیقت کے عکاس تو ہیں ہی لیکن وہ اپنی سوچ، اپنے تخیل اور تصور سے حقیقت کے ظاہری پہلو کو کرید کر اس کی باطنی حقیقت کو بھی گرفت میں لینے کی کوشش کرتے ہیں۔جیسا کہ افسانہ ''کنوار گندل'' میں لکھتے ہیں:

''جب سے نصیر انیک حوروں کے ہاتھوں شراب پینے بہشت میں چلا گیا تھا۔تب سے حاجی کا چنچل من ''گلاں'' سنگ چنگ بجانا چاہتا تھا۔اس کے چرخے پر اپنا سوت کاتنا چاہتا تھا''۔

یک دوسری جگہ افسانہ'' آدمی کے اندر چھپا آدمی'' کا ایک اقتباس ملاحظ فرمائیں:

''جناب دیش کیا آزاد ہوا، ہمارے لیے عذاب ہو گیا۔ہم تیسرے درجے کے شہری بن گئے۔ہماری حالت شودروں ''جناب دیش کیا آزاد ہوا، ہمارے لیے عذاب ہو گیا۔ہم تیسرے درجے کے شہری بن گئے۔ہماری حالت شودروں سے بھی بدتر ہو گئی۔ہماری پہچان ملک دُشمن، غدار، جنونی اور دہشت گرد بنا دی ہے ہمیں ہر میدان میں پچھاڑ دیا گیا ہے۔ہم غربت اور مسکینی کی بھٹی میں جل رہے ہیں....شیخ سعدی نے ٹھیک ہی فرمایا ہے۔کہ جس کے ہاتھ میں تیغ، اسی کے ہاتھ دیگ اور یہ لوگ ہماری ہی دیگ میں ہمارے ہی لہو سے ہمارا گوشت اُبالتے ہیں اور کُتوں کو کھلاتے ہیں۔ہماری تو دیش ماتا سوتیلی ہے اور باپ قصائی۔یہاں برابری، غیر جانبداری اور آزادی کے نعرے کھوکھلے ہیں کیوں کہ سراج ان کا راج ان کا، تخت اور تاج ان کا..ہمارا کیا؟ ہمارے نہ گھٹنے ہیں نہ ٹخنے۔جبھی تو سبھی ہمیں بندھوا سمجھتے ہیں۔ہم نہ سوئی کے قابل ہیں نہ سلائی کے''۔۸

خالد حسین نے اپنے لاشعور میں کشمیر کی کئی سالہ تاریخ کو محفوظ رکھا ہے۔اور ان کے شعور میں وہ تمام حادثات متحرک ہیں، جو تقسیمِ ملک کے خون خرابوں، ہلاکتوں اور ہجرتوں نے اس پُر امن وادی میں پیدا کیے جس سے وادی کے اندر لوگوں میں آپسی تناؤ، نفرتیں اور ایک دوسرے کے خلاف پروپیگنڈے ہونے لگے۔انھوں نے مزدور، مزارع، محنت کش اور غریب طبقے کو سیاسی لیڈروں، مذہبی رہنماؤں اور اجارہ داروں کے ہاتھوں استحصال کا شکار ہوتے دیکھا اور ان کے دکھ و درد کے لیے اپنے قلم سے احتجاج کیا۔

خالد حسین کے یہاں علاقہ نگاری کی مزید مثالیں ''ستی سر کا سورج''، ''درد و چھوڑے کا حال''، ''جمہوریت'' اور ''مجاہد'' وغیرہ سے ملتی ہیں۔افسانہ ''ستی سر کا سورج'' میں خالد حسین نے مذہب اور سیاست کے نام پر دیہی علاقوں میں غریب و پسماندہ عوام کے استحصال کی ایک عمدہ مثال پیش کی ہے۔

۴ عمر مجید:

عمر مجید نے افسانہ نگاری کا آغاز ''ایک بوڑھا ولر کے کنارے ''۱۹۶۵ء سے کیا تھا۔ان کا افسانوی مجموعہ ''اجالوں کے گاؤ'' ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا۔عمر مجید کی وفات کے بعد سلیم سالک نے ان کی کہانیوں کو بعنوان'' عمر مجید کے بہترین افسانے ۲۰۰۹ء میں ترتیب دے کر شائع کیا ہے۔مجید صاحب نے اپنے افسانوں کے موضوعات کو کشمیر کی گرد و غبار سے ہی چنا ہے۔

عمر مجید نے جب اپنی تخلیقی زندگی کا آغاز کیا تو پورے برصغیر میں جدیدیت کا چلن عام تھا۔تخلیق کاروں نے جدیدیت کی اندھی تقلید میں روایتی نکتہ کو چھوڑ کر علامتی اور تجریدی تحریریں لکھنے کو ہی ترجیح دی۔اس سے کہانی بھی متاثر ہوئی یہاں تک کہ افسانہ تجریدیت اور علامت کی بھول بھلیوں میں اس طرح کھو گیا کہ قاری کہانی کی لذت سے محروم ہو گیا۔اس لپیٹ سے ریاست جموں و کشمیر کے افسانہ نگار بھی نہیں بچ سکے۔اس طرح کی بھیڑ عمر مجید کے سامنے بھی تھی لیکن وہ افسانے کی فنی اور تکنیکی جزیات سے پوری طرح واقف تھے۔عمر مجید نے عورتوں اور بچوں پر ظالم مردوں کے جبر و استحصال اور ان کی ظالمانہ حرکتوں کو بہت دردمندی سے پیش کیا ہے۔دیہات میں ایک سرمایہ دار طبقہ ہوتا ہے جو نچلے طبقے پر ہمیشہ غالب

رہتا ہے۔ یہ ظالم لوگ گاؤں کی شریف زادیوں اور بیوی بچوں کے ساتھ کتنا سفاکانا اور بے رحمانہ سلوک کرتے ہیں۔ جس کی مثال افسانہ ''گونگے گلاب'' سے پیش کی جاسکتی ہے۔ ''گونگے گلاب'' میں دو بھائیوں گل اور ساجد کے ارد گرد کہانی گھومتی ہے۔ ساجد جو اس کا مرکزی کردار ہے وہ بول نہیں سکتا ہے۔ لیکن وہ پیدائشی گونگو نہیں بلکہ اس کا بولنا تو تب بند ہوتا ہے جب اس کے باپ نے ساجد کے سامنے اپنے تین دن کے معصوم بچے کو لات مار کر ختم کر دیا تھا۔ ساجد اس دن صرف تین سال کا تھا ایک دم خاموش ہو گیا تھا... ایسا خاموش کہ اب تک...!

''اب کی بار جو اس نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈالا تو وہ کسی نرم لچکیلی چیز سے ٹکرایا۔ اس نالے میں چھوٹی مچھلیوں کی بہتات تھی۔ اس خیال سے کہ کوئی بڑی مچھلی رہی ہو۔ ساجد نے اس نرم لچکیلی چیز کو مظبوطی کے ساتھ پکڑ لیا اور پھر اپنے دونوں ہاتھ پانی سے باہر لے آیا۔ نیلی آنکھوں میں بجلی سی چمک گئی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ ہونٹ لرزنے لگے ...! اس کے ہاتھوں میں ایک نو زائیدہ بچے کی لاش تھی...! لاش نیلی پڑ گئی تھی اور پھول گئی تھی۔ سر کے بال چپک کر رہ گئے تھے...! جب اس کا باپ اس کی ماں کو پیٹتا تو اس وقت اس کے دل میں ایک طوفان سا اٹھتا۔ اس سے بہت تیز طوفان اس وقت اس کے دل میں اٹھا۔ چیخنے کی ناتمام کوشش سے اس کا بدن لرزنے لگا۔ وہ شاید بچے کی لاش سے پوچھنا چاہتا تھا.. بھیّا تو کون ہے...؟ تو اس نالے میں کیوں پڑا ہوا تھا...؟ تمہاری ماں کون ہے...؟ تم کس کے بھیّا ہو..؟ کیا تمہارے ابو نے بھی تمہاری ماں کو پیٹا تھا؟ کیا تم بھی اپنے ابو کی لات سے مر گئے ہو....؟ وہ ہزاروں سوال نوزائیدہ بچے کی لاش سے پوچھنا چاہتا تھا۔ لیکن بچے کی لاش خاموش تھی۔ اور خود اس کی آنکھوں میں آنسوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا....! جب وہ چیخ بھی نہ سکا اور اپنے سوالوں کا جواب بھی نہ پا سکا۔ تو اس نے لاش وہیں کنارے پر ڈال دی اور پھر گلاب کی جھاڑیوں اور لمبی لمبی گھاس کو پھلانگتا ہوا بادام کے باغوں کی طرف دوڑ پڑا'' 9

عمر مجید کے کئی افسانے اس طرح کے درد ناک واقعات سے جڑے ہیں۔ انھوں نے چیزوں کو بہت غور سے دیکھ کر قلم بند کیا ہے ان کی کہانیوں میں جھول نہیں ہوتی ایک سچے عکاس کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ان کے اکثر افسانے علاقائیت کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ ان کے فسانے پڑھتے ہوئے قاری دیہات کی سیر کرنے لگتا ہے۔ وہ تمام مناظر قاری کی آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں جو کہانی کار لکھ چکا ہوتا ہے۔

بلراج بخشی:

برصغیر ہندو پاکستان کے عصری فکشن میں بلراج بخشی ایک اہم دستخط ہیں۔ بے شک ان کا شمار ہندو پاک کے اہم ترین عصری اردو افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ بخشی صاحب کا تعلق صوبہ جموں کے ضلع ادھم پور سے ہے۔ ان کے افسانوں کا ایک مجموعہ ''ایک بوند زندگی'' منظر عام پر آچکا ہے اور اس مجموعے میں شامل بارہ افسانوں ہی نے انہیں ملکی سطح پر ایک منفرد افسانہ نگار کی شناخت بنادی ہے۔ میری ناقص رائے کے مطابق اگر کسی افسانہ نگار کا ایک بھی افسانہ معیاری ہے یا صنف افسانہ کے اسرار و رموز کے عین مطابق ہے تو وہ عالمی سطح کے بہترین افسانہ نگاروں میں ضرور شامل ہونا چاہیے۔ بخشی صاحب ایک عرصے سے اردو ادب کے ساتھ جڑے ہیں اور وہ بہترین افسانوں کے خالق ہیں۔ یوں تو ان کا پورا مجموعہ علاقائیت پر مبنی ہے لیکن کئی افسانے خاص طور پر دیہات کے حوالے سے لکھے ہیں جن میں زاگرو، فیصلہ، زچ، مکلاوہ اور گرفتہ اہم ہیں۔

بلراج بخشی کے افسانوں میں مقامی منظر نامہ صاف نظر آتا ہے۔ جیسا کہ افسانہ ''فیصلہ'' میں انھوں نے ایک مرغ کو دوڑا دوڑا کر پکڑنے کی اور پھر اسے رہا کر دینے کی کی کہانی ہے۔ یہ کہانی علاقہ بھدرواہ پر مبنی ہے جو بھدرواہ کے برفیلے حسن کا دلچسپ بیانیہ ہے۔

''زاگرو'' ان کی ایک مشہور کہانی ہے۔ یہ کہانی سیاحتی جوڑوں کے ماہ عسل پر مبنی ہے۔ جو شادی کے بعد جموں کے علاقے بھدرواہ میں ہنی مون منانے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ کہانی رومانی ہے لیکن اس میں کہیں کہیں سیاسی پس منظر بھی ملتا ہے۔ مثال کے لیے اقتباس ملاحظ فرمائیں:

نہیں میڈم آپ غلط کہہ رہی ہو... اگر جموں میں ٹورزم پوٹینشل ہوتا تو مغل بادشاہ جھک مارنے کے لیے کشمیر کیوں جاتے؟... کشمیر کے باغ وغیرہ تو انہیں کی دین ہیں.. اور... مغلوں نے یہ سوچ کر تو باغ نہیں بنوائے تھے نا.. کہ آو... کشمیر کو دنیا کے لیے ایک اہم سیاحتی مرکز بنائیں... اصل میں یہ کشمیر کے ماحول کا کمال تھا کہ ان کی نفیس طبیعت نے وہاں سوندرئیہ i k s a n , z میرا مطلب ہے aesthetic expression... یعنی جموں.. جما.. جما.. جما ... کہتے ہیں سے اردو میں... وہ رک گیا.....

جمالیات ، جمالیاتی اظہار... سائمہ نے آہستہ سے کہا۔' ہاں... وہی... تو ... کشمیر کے باغ جو ہیں۔ مغلوں کی نفاست کا جمالیاتی اظہار ہیں۔...' راکیش نے سائمہ کی طرف دیکھا..' ورنہ کسی بھی مقام پر... دریا کا پانی موڑ کر... اکٹھا کر دینے سے چھوٹی سی جھیل تو بن ہی سکتی ہے۔ جیسے یہاں کیا گیا ہے.. مگر اس میں... جھیل ڈل کی طرح شکارے... ہاؤس بوٹ اور فلوٹنگ گارڈن نہیں رکھے جاسکتے۔ کہیں کہیں سے پھول لا کر لگا دینے سے اچھا سا پارک تو بن جائے گا لیکن... نشاط... اور شالیمار نہیں بن سکتا....''۔

اس کے علاوہ بھی ان کے کئی افسانے من وعن علاقائیت سے ملتے جلتے ہیں جیسے مکلاوہ، ہارا ہوا محاذ اور گرفتہ وغیرہ اہم ہیں۔ جموں ایک کنڈی علاقہ ہے جہاں پانی کی کمی عمومی زندگی کہ متاثر کرتی ہے۔ 'مکلاوہ' میں اس خطے میں بسنے والوں کو پیش آنے والی دشواریوں کی ایک جھلک دیکھیے:

'.....سب لوگ ایک بار پھر پانی پی لو.... آپ کو پتہ ہے آگے پانی نہیں ملے گا..' گجیندر نے سب کی جانب دیکھ کر کہا۔ یہ اس سفر کی آخری آب جُوتھی۔ آگے راستے میں کہیں کوئی باوڑی یا چشمہ نہیں تھا، اور اس پر مستزاد کھڑی چڑھائی۔

آفتاب ابھی نصف النہار پر بھی نہیں پہنچا تھا مگر گرمی تھی یا آسمان سے جہنم کا دہانہ کھل گیا تھا۔ آسمان کی شفاف نیلاہٹ سے لگتا تھا کہ سورج کچھ

نیچے آ گیا ہے یا پھر ہوسکتا ہے زمین خود ہی سورج کے کچھ قریب سرک گئی ہو۔

’پانی پیؤ گی ؟‘اس نے کھڑے ہوکر دلہن سے پوچھااور اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

گجیندر نے پیچھے مڑ کر ایک مشکیزہ بردار کو اشارے سے بلایا۔اس کے پاس آنے پر اس سے مشکیزہ لیا اور دہانے پر بندھا ہوا تسمہ کھول کر دلہن سے اوک بنانے کا اشارہ کیا۔دلہن نے اوک سے پانی کا ایک ہی گھونٹ پیا تھا کہ پانی اس کے منہ سے ایک زوردار آواز کے ساتھ پھوٹ پڑااور وہ چیخی۔’کیا ہوا؟‘ گجیندر نے گھبرا کر پوچھا۔

’گرم....گرم ہے....‘اس نے ہانپتے ہوئے کہا’...ابلا ہوا.....اف!‘

گجیندر نے تھوڑا سا پانی اپنے ہاتھ پر گرایا اور پھر اضطراری طور پر مشکیزہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔دوسرے آدمی نے مشکیزہ اٹھایا،اپنے ہاتھ پر کچھ پانی گرایا اور پھر تشویش سے ہونٹ سکوڑ کر باقی بچا پانی زمین پر گرانے لگا۔سب لوگ اس کی اس حرکت کو بلا احتجاج دیکھ رہے تھے۔اس قدر جوش کھائے پانی کا بوجھ اٹھائے چلنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔گجیندر نے چلنے کا اشارہ کیا اور قطار پھر چل پڑی۔

’سنو جی...‘ دلہن کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمنے لگی تھیں’...آپ نے کہا تھا کہ ایک گھنٹے کا راستہ رہ گیا ہے...ان کو کہیں...‘اس نے باراتیوں کی طرف اشارہ کیا’... کہ یہ چلتے جائیں اور...ان میں سے کوئی پانی لے کر واپس آ جائے....میں اب پانی پیے بن آگے نہیں جاسکوں گی...‘

گجیندر کچھ دیر سوچتا رہا پھر اٹھا اور بارات میں شامل کچھ دوستوں کو ایک طرف لے گیا۔اس نے اپنی الجھن ان کے سامنے رکھی۔

’مشکل ہے...تمھیں تو پتہ ہے کہ ہمارا گاؤں یہاں سے کم سے کم تین گھنٹے کے فاصلے پر ہے...تین گھنٹے جانا اور تین آنا....چھ گھنٹے ہیں تمہارے پاس؟‘اس کے دوست نے کہا۔

’اور سانگر ندی بھی یہاں سے اتنے ہی فاصلے پر ہے...وہاں سے پانی لانے میں بھی اتنا ہی وقت لگے گا...‘

ایک ایک کر کے سب لوگ وہیں اکٹھا ہو گئے اور بات سب باراتیوں میں پھیل گئی۔پھر سب لوگ دلہن کے پاس آ گئے۔جب اسے منزل کے صحیح فاصلے کا پتہ چلا تو بے بس ہو کر ہونٹوں پر جمی پپڑیوں پر زبان پھیرتے ہوئے نقاہت سے بولی:

’قسمت میں میری موت یہیں ہونا لکھی تھی...کسی کا کوئی قصور نہیں...‘

کوئی کچھ نہ بولا۔لیکن سب کے چہروں کا رنگ اڑا ہوا تھا۔

’یہاں ٹھہرنے کا کوئی فائدہ نہیں...‘کسی نے کہا’...آگے چلتے ہی رہنا چاہیے...‘

’سنو جی...‘ دلہن نے گجیندر سے رک رک کر کہا’مجھے یہیں چھوڑ جایئے...میرا ساتھ بس اتنا ہی تھا...‘اس کا گلا رندھ گیا۔‘

میرے ذاتی مطالعے کے مطابق بلراج بخشی کے زیادہ تر افسانے علاقائی مسائل و مصائب سے بہت قریب ہیں۔بخشی صاحب کے افسانے اور مضامین نہ صرف اندرون ملک بلکہ سرحد پار کے مقتدر رسالوں میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں۔ان کے افسانوں کی ایک خاصیت گاڑھے بیانیہ کے حوالے سے ہے جو ان کی ایک الگ پہچان ہے۔انھوں نے جموں و کشمیر کو سیاحتی مرکز دکھانے کے ساتھ ساتھ وہاں کے نجی مسائل کو بھی بروئے کار لایا ہے۔یہی خصوصیات ان کو ایک سچا اور سنجیدہ کہانی کار کہلوانے کا ثبوت ہیں۔بے شک بلراج بخشی اردو افسانے کا ایک دستخط ہیں۔

مشتاق احمد وانی کینی:

مشتاق احمد وانی کا شمار جموں و کشمیر کے لکھنے والوں کی نئی پود میں سرفہرست ہوتا ہے۔مشتاق احمد کا ایک اپنا اندازِ بیاں ہے وہ نہ تو کسی سے متاثر ہیں اور نہ ہی کسی کے راستے پر چلنے کے قائل ہیں۔وہ انسانی مقدر اور انسانی قدروں کی شکست و ریخت کے بارے میں بعض دوسرے قلم قاروں کی طرح قسطوں میں نہیں سوچتے بلکہ یہ تشویش و تردّد اور مظلوم قوم پر موجودہ سیاسی و سماجی اثرات ان کی جان کے ساتھ لگے رہتے ہیں۔

کینی کی کہانیوں میں عوام دوستی اور انسان دوستی کی تابناک تصویریں رچی ہوئی ہیں۔انہوں نے سیاسی اور سماجی مسائل کے ساتھ ساتھ دیہاتی اور متوسط طبقہ کے مسائل پر قلم اٹھایا ہے۔وہ اپنی کہانیوں میں دیہات کے ہنر مند لوگوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ان کی دیہاتی کہانیوں میں ’’کاریگری‘‘،’’لگام‘‘،’’شفقت‘‘ وغیرہ اہم ہیں۔’’کاریگری‘‘ میں کینی نے دیہات کے ایک اعلیٰ پایہ کاریگر مہیدہ میر کو کہانی کا موضوع بنایا ہے۔وہ ایک خاندانی کاریگر’’مستری‘‘ تھا جس کے والد حضر میر ایک درویش صفت اور ایماندار انسان تھے۔اشرف اور اس کے ساتھ کچھ فرنگی مہیدہ میر کے گھر اس کی علیٰ پایہ کاریگری کا نمونہ (پرانی ڈیزائن) کا مکان دیکھنے آتے ہیں:

’’اس مکان کا رکھ رکھاؤ کیوں نہیں ہوا...؟اشرف نے پھر ایک سوال کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا۔’’میرے والد کی ہی طرح میری آمدنی بھی قلیل تھی کے گھر کے اخراجات ہی چل سکیں...‘‘۔

مہیدہ صرف لکڑی کا ہی کاریگر نہیں بلکہ اپنے ہاتھوں سے کشمیری (پشمینے) شال بھی بناتا تھا۔کچھ بنے ہوئے شال جب اشرف اس دن وہاں سے لے گیا تو بہت وقت تک نہ اشرف آیا اور نہ ہی شالز کی قیمت بھیجی۔مہیدہ میر اس کی وجہ سے بہت غصّہ ہوا اور اشرف اور فرنگی کو گالی گلوچ کرنے لگا:

’’باہر نکال دو اشرف اور فرنگی کو......ان کی وجہ سے میں برباد ہو گیا...فاقے ہونے لگے...‘‘مہیدہ میر غصے سے چیخ پڑا۔’’مبارک ہو...مبارک ہو..کہتے ہوئے اشرف کمرے میں داخل ہوا اشرف کے ہاتھ میں ایک سوٹ کیس تھا اشرف کے پیچھے فرنگی بھی مسکراتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔مہید میر کا غصّہ کم نہیں ہو رہا تھا،اور وہ دونوں کو حقارت سے دیکھنے لگا اس سے پہلے کے مہیدہ میر کچھ اور کہتا...اشرف نے روپیوں سے بھرا سوٹ کیس کھول کر دکھایا’’یہ پندرہ لاکھ روپے ہیں...اس میں سے پانچ لاکھ اس مکان کے رکھ رکھاؤ کے لئے...تین لاکھ روپے ان شالوں کے جو میں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور باقی سات لاکھ

روپے زمین خرید کر اپنا مکان بنانے کے لیے...''۔اشرف نے مہیدہ میر کی طرف بنا دیکھے کہا اور سوٹ کیس اس کی طرف بڑھا دیا۔''یہ میرے ساتھ جان مائیکل ہے....ان سے آپ کو ایک معاہدہ کرنا ہوگا کہ آپ اپنا مال صرف ان کو ہی دیں گے اور یہ لو پیشگی کے تین لاکھ روپے کا چیک..''فرنگی نے مسکراتے ہوئے چیک مہیدہ میر کی طرف بڑھا دیا..مہیدہ میر کو اپنی قوت سماعت پر یقین نہیں ہو رہا تھا وہ ہکا بکا، مجسمہ بنا، اشرف اور فرنگی کو تاک رہا تھا....اس کا ہاتھ لاشعوری انداز میں فرہنگی کی طرف بڑھا''۔۱۰

مشتاق صاحب اپنی اُستادانہ ذمہ داری کے ساتھ ساتھ دل و جان سے لکھتے بھی ہیں۔ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہر کہانی کو ایک نیا رُخ دیتے ہیں۔انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ کئی انگریزی کتابیں بھی تصنیف کی ہیں۔جن میں **1.Behaviour ,mis behaviour and discipline 2.Cherishing your child.3.understanding unsuccessful and 4.What education is not. 5.Make home work a fun.** وغیرہ اہم ہیں۔

عبدالغنی شیخ:

عبدالغنی شیخ بالعموم عصر حاضر اور بلخصوص جموں و کشمیر کے افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ان کا تعلق لداخ کے خطہ لیہہ سے ہے۔غنی صاحب کافی عرصے سے کہانیاں لکھتے ہیں اور خاص بات یہ کہ وہ کہانیاں لکھنا جانتے ہیں یعنی افسانہ نگاری کے اسرار و رموز سے بخوبی واقف ہیں۔ان کے چار افسانوی مجموعے زوجیلہ کے آر پار، دوراہا، دو ملک ایک کہانی اور ایک انگریزی مجموعہ **forsaking paradise** شائع ہو چکے ہیں۔عبدل غنی شیخ کی نظر سماج کے ہر طبقے پر رہتی ہے انھوں نے تین دہائیوں سے کشمیر کے منجمد ماحول کو اپنی کہانیوں سے جنبش دی ہے۔یوں تو انھوں نے سیاسی، سماجی اور ثقافتی موضوعات پر خوب لکھا ہے مگر کشمیر میں گولا باری، بم دھماکے، معصوموں کی لتھڑی لاشوں اور ماؤں کی سسکیوں آوازوں کو اپنے افسانوں میں خاص طور پر پیش کیا ہے۔اس بھیڑ بھاڑ کے دور میں اس قسم کی سماجی اور سیاسی کہانیاں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہیں۔جن کو عبدل غنی صاحب نے بلفرض خلق کیا ہے۔

عبدالغنی شیخ کے افسانوں سے صاف عیاں ہے کہ وہ کسی نظریے کی حمایت یا مخالفت نہیں کر رہے ہیں، نہ ہی اشتہار بازی کر رہے ہیں بلکہ صاف محسوس ہوتا ہے کہ وہ کہانی اور صرف کہانی سنا رہے ہیں۔ زندگی، ہیرو، راشن کارڈ، رازدل، مجھے یہ آدمی نہیں چاہیے، یادیں، مظلوم، نام اچھی کہانیاں ہیں۔ان افسانوں میں تقسیم وطن کی دردناک بازگشت نظر آتی ہے۔خاندان، افراد، حادثاتی طور پر تقسیم ہو کر حد متارکہ کے اس پار یا اس پار رہ جاتے ہیں اور رشتوں میں تلخیاں، حسرتیں، جدائیاں بیان کرتے ہوئے غنی کی تحریروں سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ مناظر نہ صرف غنی شیخ نے خود دیکھے ہیں بلکہ قلبی سطح پر شدت سے محسوس بھی کیے ہیں اور اسی لئے لداخ کی برفیلی ہوائیں اور وہاں کے برف زاروں کا منظر نظروں کے سامنے آ جاتا ہے۔عبدالغنی شیخ کے افسانوں کے واقعات کیوں کے عام لوگوں کے زندگیوں سے وابستہ ہیں اس لئے واقعات کے بیان کے ساتھ لداخ کے پس منظر کی تصویر بھی سامنے آ جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے کئی افسانوں کے واقعات کا منظر نامہ مانوس لگتا ہے۔

مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جموں و کشمیر کے لگ بھگ تمام افسانہ نگاروں میں کہیں نہ کہیں علاقائیت اثر پایا جاتا ہے۔مختلف قسم کے علاقائی یا دیہات کے پہلو کو مختلف ضمن میں پیش کیا گیا ہے۔کئی افسانہ نگاروں نے وادی میں خالص خوبصورتی کو دکھایا ہے اور کچھ کے یہاں دیہات کے اصل مسائل دیکھنے کو ملتے ہیں جیسے سرمایہ دار طبقے کا غریب و مزارع پر ظلم و ستم اور ان کا سماجی و اقتصادی استحصال وغیرہ۔ان افسانہ نگاروں نے تقریباً تمام موضوعات کو اپنے افسانوں میں پیش کیا ہے۔کیونکہ کوئی بھی تخلیقکار اپنے علاقے یا اپنی مٹی کی خوشبو سے دور رہ کر اپنی تحریر میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔اسی اثنا میں گوپی چند نارنگ نے ''مشرقی شعریات'' اور ''ساختیات و پس ساختیات'' میں لکھا ہے کہ:

''کوئی بھی ادیب خواہ لاکھ کوشش کیوں نہ کر لے اپنے معاشرے اور تہذیب سے الگ ہو کر ادب کی تخلیق نہیں کر سکتا۔جس معاشرہ اور تہذیب میں وہ پلا اور بڑھا ہے۔یہ ایک بہت ہی اہم سماجی اور نفسیاتی نقطہ ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اردو فکشن اور خاص طور پر افسانہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ابتداء سے لے کر آج تک ہر افسانہ نگار نے چاہے اس کا تعلق کسی بھی تحریک یا رجحان یا رویہ سے کیوں نہ ہو لازمی طور پر ایسے افسانے لکھے ہیں جن میں علاقائی عناصر نمایاں طور پر موجود ہیں''۔۱۲ ●●

افسانہ ”خیال صورت“ کا تنقیدی جائزہ

محمد خوشتر

اردو زبان و ادب میں مختصر افسانہ مغربی ادب کی دین ہے اور مغرب کی زبانوں میں ایک جدید ادب کی حیثیت سے انیسویں صدی کے آخر کی پیداوار ہے۔ بیسویں صدی کے شروع میں اردو ادب میں ابتدائی افسانہ لکھنے والوں میں منشی پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور راشد الخیری کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ درحقیقت یہ صنف ملک کے بدلتے ہوئے حالات، نئے خیالات اور ادب کے نئے تقاضوں کی وجہ سے معرض وجود میں آئیں۔

سریندر پرکاش کی شہرت ان کی افسانہ نگاری کی وجہ سے ہے۔ اس سے پہلے کہ افسانہ کا تنقیدی جائزہ لیا جائے اور اس کے متعلق اپنی معلومات کو صفحۂ قرطاس پر رقم کیا جائے، ان کے افسانہ پر قلم چلانے سے پہلے مناسب وموزوں یہی ہے کہ صاحب افسانہ کو سمجھا جائے۔ سریندر پرکاش کا جنم لائل پور پنجاب میں، 1930ء میں ہوا تھا، جواب پاکستان کا حصہ ہے۔ ان کا گھریلو نام سریندر کمار اوبرائے ہے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور سے اسکول کا امتحان پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے پاس کیا اور صرف گیارہ برس کی عمر میں سریندر پرکاش کی پہلی کہانی ہفتہ وار پارس میں شائع ہوئی تھی۔ تقسیم وطن کے فوراً بعد دہلی آگئے اور ہاکر، رکشا پولر، پھول بیچنے اور ڈھابہ چلانے جیسے زندگی کی سچائیوں سے جڑے ہوئے کام کر کے انہوں نے خود کو مختلف قسم کے تجربات کی بھٹی میں تپا کر کندن بنالیا۔ سریندر پرکاش کا پہلا افسانوی مجموعہ ”دوسرے آدمی کا ڈرائنگ روم“ 1968ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد 1980ء میں ”برف پر مکالمہ“ اور 1988ء میں تیسرا مجموعہ بنام ”بازگوئی“ منظر عام پر آیا۔ 1989ء میں بازگوئی پر سریندر پرکاش کو ساہتیہ اکادمی کے اعزاز سے نوازا گیا۔ اس سے قبل کہ افسانہ ”خیال صورت“ کا تنقیدی جائزہ پیش کیا جائے افسانہ کسے کہتے ہیں کو ”اصناف ادب اردو“ نامی کتاب کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ”مختصر افسانے کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مختصر افسانہ ایک ایسا نثری قصہ ہے جس کے پڑھنے میں آدھ گھنٹہ تک کا وقت لگے یا یہ کہ مختصر افسانہ کسی شخص کی زندگی کے سب سے اہم اور دلچسپ موقع کو ڈرامائی شکل میں پیش کرنے کا نام ہے۔ ایک عالم نے یہ بھی کہا ہے کہ مختصر افسانہ کسی ایسے واقعہ کا بیان ہے جو سنا نہ گیا ہو لیکن جو کسی کو پیش آیا یا آسکتا ہو۔ ایک دوسرے ناقد کا کہنا ہے مختصر افسانہ کسی ایک واقعہ کا بیان ہے جس میں ابتداء ہو، درمیان ہو، عروج ہو اور خاتمہ ہو“۔ (اصناف ادب اردو، مطبوعہ ایجوکیشنل پبلیکیشنز ہاؤس علی گڑھ۔ ص ۱۱۶)

الغرض افسانہ کی مختلف تعریفیں، تشریحیں وتفسیریں اور تعبیریں کی گئی ہیں مگر کوئی حتمی تعریف نہیں ہے اور نہ ہی حرفِ آخر! اسی طرح افسانے کے اجزائے ترکیبی میں بھی اختلاف رہا ہے اور علمائے افسانہ کے درمیان یہ بحث بھی سرگرم رہی ہے مگر ان میں زیادہ تر پلاٹ، کردار، نقطۂ نظر، ماحول اور فضاء، اسلوب وطرز نگارش، آغاز واختتام اور وحدت تاثر کو قبول کرتے ہوئے انہیں صنف افسانہ کے اجزائے ترکیبی میں شامل کیا ہے۔

سریندر پرکاش کا ایک افسانوی مجموعہ بنام ”حاضر حال جاری“ جسے تخلیق کار پبلیشرز نئی دہلی نے شائع کیا ہے۔ اس میں ان کا ایک افسانہ بعنوان ”خیال صورت“ جو کہ فہرست کی ترتیب کے اعتبار سے آٹھواں افسانہ ہے۔ اس پر تفصیلی بحث حاضر خدمت ہے۔

خیال صورت سریندر پرکاش کے نکلے ہوئے قلم کا ایک شاہکار افسانہ ہے، اور خیالی دنیا میں سیر کرا کے ہندوستان و پاکستان میں بٹوارہ کی صورت حال اور تقسیم ہند اور ان دونوں میں پیدا شدہ کشمکش وچشمک کو خیال کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ نازک گھڑی، وقت کی ہلچل اور خیالصورت کی ذہنی الجھن کو قلم زد کر کے ایک ایسا افسانہ تحریر کیا ہے جسے ہم حقیقت پر مبنی قرار دے سکتے ہیں، تو پاکستان کی صورت حال اور ہندوستان میں رہنے والوں کی سرسری داستان بھی۔ چونکہ خود سریندر پرکاش پاکستان میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں پلے بڑھے بھی تھے لہٰذا ماضی کی پوری صورت حال ہمیشہ ان کے اردگرد چکر لگاتی رہتی تھیں اور بیتے لمحے کی یاد ستاتی رہتی تھی۔ کبھی والدہ کی جدائیگی پر غم، تو والد سے دوری پر الم، ہجرت کا خوف تو وطن کی محبت کا اثر اس افسانہ میں جابجا دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس افسانہ کے مین واہم کردار افسانہ نگار کی ذات ہے اور ذیلی کردار یا بقیہ کرداران کی فیملی ادا کر رہی ہے۔ جسے Flash Back کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ گویا اسے خواب کی شکل سے مشکل کر کے پیش کیا ہے جو دعوت نظارہ، قابل غور وفکر اور سوچ کی تبدیلی پر اصرار کرتا ہے۔ خیال صورت ماضی کی ایک داستان ہے جسے افسانہ کی شکل میں نذر قارئین کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا ہی پیراگراف دل کے دہلانے کو یہ خیال اچھا ہے کی ملاحظہ کریں:

”اس دن اخبار چھوا تو ہاتھوں کی انگلیاں جل گئیں۔ ہر سطر کی جگہ انگارے رکھے تھے۔ باہر گلی تنکوں کے گزرنے کی کیسی کھڑکھڑاہٹ سنائی دینے لگی۔ پاکستان کے ساتھ فوری جنگ کا خطرہ ہے۔“ (خاصر حال جاری، سریندر پرکاش۔ ص ۱۳۶)

افسانہ نگار کا قلب پاکستان کی طرف بھی مائل تھا چونکہ ان کی پیدائش پاکستان کی تھی اور اس نے زندگی کے ابتدائی ایام کو وہیں گزارا تھا لہٰذا پہلے وطن کی محبت برقرار رہی۔ اور تخلیق کار صرف اپنے لئے نہیں لکھتا بلکہ سماج ومعاشرہ کے لئے لکھتا ہے، ان کے سامنے اصلاح کا نظریہ بھی پیش رہتا

ہے پھر تعصب و تنگ نظری سے بلند ہو کر صرف اور صرف انسانیت کے لئے تحریر کرتا ہے۔ اس افسانہ میں محترم نے اپنی ذاتی کیفیت کو بھی تحریر کیا ہے اور کس طرح سے قلم کی طاقت صرف کی ہے، آپ بھی دیکھیں:

''یہ میری ذاتی کیفیت ہے، جب میں نے اپنے آپ کو سماج سے الگ سمجھا لیا، اور جب ایک پل کو اخبار پڑھتے پڑھتے، میں اپنے آپ کو سماج کا ایک حصہ سمجھتا ہوں تو پوری کی پوری صورت حال بدل جاتی ہے، ذہن دھندلا جاتا ہے، انگارے دہکنے لگتے ہیں۔ مہنگائی کا ذکر، لامکانی کا ذکر اور غیر محفوظ ہونے کے احساس کا ذکر غیر فنکارانہ ہے، اور مجھے کوئی ایسی چیز، کوئی ایسا طور طریقہ پسند ہی نہیں جو غیر فنکارانہ ہو''۔ (ایضاً)

افسانہ نگار بڑی کوشش محنت اور جدوجہد سے کردار کو اس طرح تراشتا ہے کہ وہ قاری کے دل میں گھر کر سکے۔ سریندر پرکاش بذات خود کردار ہیں اور انہوں نے اپنے آپ کو اس افسانہ میں امر کر لیا ہے، مثلاً

''ہم اس محلّہ میں داخل ہوئے، گلیاں ویسے ہی تھیں، ان میں مکان ویسے ہی تھے لیکن محلّہ کے سامنے جو خالی میدان ہوا کرتا تھا۔ اس میں کئی مکان بن گئے تھے جس سے جغرافیہ بدل گیا تھا۔ ہم اپنے آبائی مکان کے سامنے زیادہ دیر تک کھڑے نہ رہ سکے، بہت سی آنکھیں دیواروں کے پیچھے سے ہمیں گھورنے لگی تھیں۔ اچانک میں نے دیکھا، بابوجی گھر سے تیار ہو کر دوکان جانے کے لئے نکلے ہیں ماں انہیں دروازے تک چھوڑنے آئی ہے''۔ (حاضر حال جاری، ص۱۳۹)

مذکورہ جملے میں کردار نگاری، واقعہ نگاری کے ساتھ ساتھ ماحول اور فضا بھی ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اور کس باریکی سے والد و والدہ کی ملاقات، رخصت اور الوداع کی صورت حال کو تحریر کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔

اجزائے ترکیبی کا ایک جزء نقطۂ نظر بھی ہے، پہلے ہم نقطۂ نظر کو سمجھتے ہیں کہ نقطۂ نظر ہے کیا؟

''نقطۂ نظر سے کسی انسان کو مفر نہیں خاص طور پر مصنف کو کیونکہ وہ زیادہ حساس اور باشعور ہوتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اچھا فن کار اپنا نقطۂ نظر قاری پر تھوپتا نہیں۔ اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ کھل کر کچھ نہ کہے بلکہ اپنی تخلیق کو اس طرح پیش کرے کہ فنکار کے دل کی بات آپ سے آپ قاری کے دل میں آجائے'' (اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، ص۱۴۸)

اسی طرح سے مشہور افسانہ نگار نے ملک کی تقسیم کا ذمہ دار کسے قرار دیا ہے اور یہ الزام کس کے سر......... تھوپا ہے ملاحظہ فرمائیں:

''اس کی روشنی میں یہ پورا پیراگراف پڑھنے کے قابل ہے ''میری بیوی کو خیال آیا کہ اس نے کالز کے پیسے تو دیئے ہی نہیں۔ اس نے اپنے بیگ میں سے نکال کر قصاب کی طرف ایک سو کا نوٹ بڑھایا اور کہا ''بہت بہت شکریہ بھائی صاحب'' قصاب نے نوٹ پر اچٹتی سی ایک نظر ڈالی، اور حیرانی سے میری بیوی اور میری طرف دیکھا۔ اوہ! تو آپ ہندوستان سے آئے ہیں''۔ دونوں گویا اس طرح گھبرا گئے جیسے ہماری چوری پکڑی گئی ہو۔ معاف کیجئے گا۔ قصاب نے کہا۔ یہاں یہ کرنسی نہیں چلتی۔ میرے ذہن میں جیسے ایک کوندہ سا لپک گیا۔ اچھا تو گویا یہ بات ہے''۔ میں بڑبڑایا۔ تو یہ کرنسی ہی ہے کہ جو ہمیں ایک دوسرے سے الگ کرتی ہے اور ہماری قومیت کی شناخت کرتی ہے۔'' (حاضر حال جاری، ص۱۴۳/۱۴۴)

ایسے وقت میں ہمیں ان دونوں سے ہمدردی ہو جاتی ہے اور تقسیم ہند اور ملک سے نفرت یہی افسانہ نگار کا مطمح نظر اور نقطۂ نظر ہے جو قاری کا دل بغیر محسوس کئے نہیں رہ سکتا۔ اجزائے ترکیبی کا ایک جزء ہے اسلوب، پرکاش صاحب اسلوب نگاری میں بھی اپنی شناخت بنائے ہوئے ہیں اور افسانہ خیال صورت میں بحیثیت اسلوب کے بھی وہ کامیاب ہیں، چونکہ افسانہ مختصر ہوتا ہے اس لئے افسانہ میں کیا لکھنا چاہئے، سے زیادہ ضروری یہ جاننا ضروری ہے کہ کیا نہیں لکھنا چاہئے یعنی اس میں کم لفظوں میں زیادہ بات کہہ جانے کا ہنر آنا چاہئے۔ ایک جگہ دیکھیں کس طرح سے اسلوب کی غمازی نظر آتی ہے:

''سڑک ہمارے آگے چل رہی تھی اور ہم اس کے پیچھے پیچھے، سامنے ایک اونچا کلس نظر آیا۔ وہاں ایک ویران مندر تھا جس کے چبوترے پر کچھ لوگ سفید دھوتیاں اور سفید کرتے پہنے بیٹھے آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے اپنی پیٹھ کو کھجانے کے لئے ایک ہاتھ کرتے کے نیچے سے ڈالا اور دوسرا ہاتھ کرتے کے گلے میں سے اور گردن پر پڑے ہوئے جنیؤں کو پکڑ کر اس طرح اوپر کھینچا کہ پیٹھ کھجانے کا اچھا خاصا وسیلہ بن گیا۔ (ص،۱۴۱/ایضاً)

اگر افسانے کے لئے آغاز و اختتام بھی اجزائے ترکیبی میں شامل ہے تو آغاز ہم کر کے دیکھ چکے ہیں اب اختتام کر کے دیکھتے ہیں اور آخری پیراگراف پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں اس سے قبل سنبل نگار نے آغاز و اختتام کے تعلق سے کیا اور کس طرح تحریر کیا ہے دیکھیں وہ یوں لکھتی ہیں:

''آغاز و اختتام پر بھی افسانے کی کامیابی اور ناکامی کا سہرا ہے۔ افسانے کا آغاز اس طرح ہونا چاہئے کہ قاری فوراً اس طرف متوجہ ہو جائے۔ اب یہ افسانہ نگار کا ہنر ہے کہ اس توجہ کو افسانے سے ہٹنے نہ دے۔ ہر لحظہ یہ تجسس باقی رہے کہ اب کیا ہونے والا ہے اور جب کہانی ختم ہو تو اس طرح کہ پڑھنے والا مدتوں اس کی گرفت سے نہ نکل سکے۔''
(اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ، سنبل نگار۔ ص۱۴۹)

''اچانک مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ انہیں وہاں چھوڑ آئے تھے جہاں سے واپس جانے کا راستہ بھول چکے تھے۔ ہمارے سامنے ایک کشادہ شفاف سڑک تھی۔ جس پر نئی چمکدار، خوبصورت گاڑیاں دوڑی چلی جارہی تھیں۔ ہمارے گرد بہت سے ہم شکل بچے تھے۔ لیکن ہم انہیں کیسے بتائیں کہ ہمارے بچوں کی شکلیں ویسی ہیں جیسی ان کی ہیں، اور ہم انہیں کہاں چھوڑ آئے ہیں یہ نہیں جانتے۔ اچانک میری بیوی پھوٹ کر رونے لگی۔ لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس اندوہناک حادثہ کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوئی''۔
(حاضر حال جاری، سریندر پرکاش۔ ص۱۴۵)

مذکورہ باتیں واقعی دل کو دہلانے، دماغ کو سوچنے اور زبان کو کچھ

بڑبڑانے، بولنے اور ہاتھ و پاؤں کے ساتھ جسم کو مفلوج کرنے پر آمادہ کرتی ہیں اور یہ ان کے افسانے کے اختتام کی ایک کامیاب کوشش ہے۔

الغرض اپنی اس سعی نامکمل کو اردو ادب کی مشہور شخصیت گوپی چند نارنگ کی رائے پر ختم کرتا ہوں ''سریندر پرکاش کی بیشتر تخلیقات کہانی پن کی ان خصوصیات سے لبریز ہوتی ہیں جو ذہن اور شعور کی ان دیکھی سطحوں کو اجاگر کرتی ہیں، اور زندگی کے گوناگوں مسائل سے رمزیہ طور پر جڑی ہوتی ہیں۔ سریندر پرکاش نے ساٹھ کی دہائی سے اب تک نئے افسانے کی تخلیق اور ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کی کہانیوں کے کردار کچھ جانے پہچانے، کچھ اجنبی مگر مانوس سے ہر دور میں ہمارے اردگرد ہی موجود رہتے ہیں۔ سریندر پرکاش کے اسلوب میں ایک پراسراری سی چالاکی قدم قدم پر قاری کے ساتھ چلتی ہے۔ اور کہانی کی ساری فضا ایک رمز میں بھیگی بھیگی سی رہتی ہے۔ علامتی افسانہ نگاری میں سریندر پرکاش کو ملکہ حاصل ہے۔''

(حاضر حال جاری، پشت پر)

اب ہم یہ برملا کہہ سکتے ہیں کہ بایں ہمہ وجہ سریندر پرکاش نے پچھلی نصف صدی صنف افسانہ پر اچھے افسانہ نگار کی حیثیت سے اردو ادب پر حکومت کی ہے۔

راہ نما:۔

حاضر حال جاری مجموعہ (افسانہ) سریندر پرکاش مطبوعہ تخلیق کار پبلیشر نئی دہلی

اصناف ادب اردو ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس، علیگڑھ

اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ سنبل نگار فاطمہ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس ،علیگڑھ ●●

نائن الیون کے بعد افغانستان میں مزاحمتی شاعری

عمر آفریدی

افغانستان میں 1989 کے انقلابِ ثور کے بعد ایسی خانہ جنگی شروع ہوئی جس کے شعلے اب بھی لپک رہے ہیں۔ اس کا اثر افغان شاعری پر بھی ہوا۔ خاص طور پر نائن الیون کے بعد امریکی یلغار اور طالبان حکومت کے خاتمے کے بعد پشتو میں مزاحمتی شاعری کو بہت زیادہ پذیرائی ملی۔

ابتلا کے اس دور میں شعرا کے ایک بڑے طبقے نے لب و رخسار اور گل و بلبل کے بجائے ملک میں سیاسی اور جنگی دنگل سے براہِ راست متاثر ہونے والے نہتے عوام کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔

اس طرح پشتو ادب میں ایک لمبے عرصے بعد مزاحمتی شاعری کو پھر سے فروغ اور عوامی پذیرائی ملی۔

اس مزاحمتی روایت کے علمبردار اور معروف افغان شاعر مطیع اللہ تراب کا کہنا ہے کہ وہ کسی پر تنقید نہیں کرنا چاہتے۔ مگر ان کے خیال میں جنگ و جدل کے دور میں رومان اور رومانوی شاعری کوئی معنی نہیں رکھتی۔

'رومان تو اس وقت لکھا جاتا ہے جب امن ہو۔ جب روٹی، کپڑا اور مکان کی فکر نہ ہو۔ جنگ و جدل نہ ہو۔ میرے خیال میں شعر وہ ہے جس میں کسی بے کس اور مجبور کے احساسات کو زبان ملے۔'

افغانستان میں برسرِ پیکار قوتوں پر طنز کے تیروں کی بوچھاڑ لیے ان کی ایک نظم کا بند ہے:

'وہ ہماری بقا کے لیے اپنا خون نہیں بہا رہے
ہماری بہبود و فلاح کے لیے خون نہیں بہا رہے
وہ اپنے مقاصد، حکمت عملیاں اور اہداف رکھتے ہیں
ان کی سیاستیں دورخی اور چار رخی ہیں۔
وہ اپنے تربیت یافتہ ایجنٹ اور ایجنسیاں رکھتے ہیں
وہ تو اپنے اہداف کے حصول کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہیں'

مطیع اللہ تراب پیشے کے اعتبار سے کاروں کے باڈی میکر ہیں

افغانستان میں عصری مزاحمتی شاعری کے باب میں عزت اللہ ؟ واب، سم ؟ ع اللدت ؟ ون، پرھیز شکیو ال، زاہد اللہ ظاہر اور تحسین اللہ تحسین کے نام بھی نمایاں ہیں۔ جبکہ نوجوان خواتین شاعرات میں نبیلہ وفا، ہماسہ اور شفیقہ خپلواک شامل ہیں مگر ان کی شاعری مزاحمتی سے زیادہ ملّی ہے۔

نبیلہ وفا کے کلام کا ایک نمونہ:

'میں ملت کے غم میں سلگ رہی ہوں

میرے ہم وطن غفلت کی نیند سونا سیکھ چکے ہیں

میرے بابا نے کہا تھا کہ وہ قوم مٹ جاتی ہے
غفلت کی نیند جس کا شعار ہو
میں نہیں چاہتی کہ میری قوم مٹ جائے
اور میرے بابا کی بات سچ ہو جائے'

شفیقہ خپلواک افغان پرچم کے سیاہ، سرخ اور سبز رنگوں پر تنقید کرنے والوں کے جواب میں کہتی ہیں:

'میرا پرچم تو رنگوں سے سجا ہوا ہے
ارے، تم اس سیاہ رنگ کو وحشت کا رنگ کہتے ہو
مجھے تو یہ سیاہ رات کا سا سکون بخشتا ہے
یہ تو اُن اندھیروں جیسا ہے، جن میں
میری چراغ کی سی آنکھیں روشنی لاتی ہیں
جن میں میرا دل دھڑکتا ہے اور میرا انگ انگ پناہ لیتا ہے'

ان شعرا نے نئی تشبیہوں، استعاروں اور تراکیب کا بھی خوب استعمال کیا ہے۔ مثلاً عزت اللہ ؟ واب نے اِنھیں یوں برتا ہے۔

'آج پختون ٹررِسٹ کے طور پر بدنام ہے
وہ بدبخت ہے جو اس قوم کا ہے
آج اس میں شرم محسوس نہیں ہوتی
کہ ہر ادارے میں رشوت عام ہے
اور جو اس نظام کا مخالف ہے
اس کا مقام گوانتاناموبا یا بگرام ہے'

مگر کابل میں بی بی سی پشتو کے نامہ نگار، شاعر اور نقاد مصطفٰی سالک کے مطابق پشتو ادب میں موجودہ مزاحمتی شاعری کوئی نئی بات نہیں۔

'تقریباً چار سو سال پہلے خوشحال خٹک نے مغلوں کی مزاحمت کی تو اس کی جھلک ان کی شاعری میں بھی نظر آئی۔ افغانستان میں انقلاب ثور کے بعد سلیمان لائق اور پختونخواہ میں اجمل خٹک نے خان اور جاگیردار کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ آج کی مزاحمتی شاعری کو عوامی قبولیت تو حاصل ہے مگر اس میں فیض اور ساحر لدھیانوی والی بات نہیں۔'

فیض اور ساحر یا اجمل اور لائق جیسا آہنگ نہ سہی مگر مطیع اللہ تراب کہتے ہیں کہ وہ تو کسی گروہ یا نظام کے حامی نہیں، بلکہ عوامی احساسات کے ترجمان ہیں۔

'میں سرکاری اہلکار ہوں، نہ طالبان کا ترجمان اور نہ ہی غیر ملکی افواج کا وظیفہ خوار۔ جو عوام کا مجرم ہوگا، میری انگلی اس کی طرف اٹھے گی۔'

مصطفٰی سالک عوامی پذیرائی کو شاعری کا معیار نہیں گردانتے۔ ان کے بقول یہ جذبات سیاسی حالات کے تابع ہوتے ہیں جن کی عمر لمبی نہیں ہوتی۔

سالک کی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ حال، ماضی کا تابع نہیں ہوتا۔ مگر اکیسویں صدی کی اس افغان مزاحمتی شاعری کی مقبولیت میں انٹرنیٹ کا بھی بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اِن افغان شعراء کا کلام سوشل میڈیا بشمول یوٹیوب پر وسیع پیمانے پر دستیاب اور شیئر ہوا۔ ہر کلپ کے سننے اور دیکھنے والوں کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ممکن ہے کہ انٹرنیٹ کے فیض اس بار افغان مزاحمتی شاعری اتنی جلد فراموش نہ ہو۔ ●●

سہ ماہی — میرا روڈ، تھانے

ادب گاؤں

۵۰ روپے

ترتیب وتہذیب

اشتیاق سعید

9930211461

پرچھائیاں

(کہانیوں کا مجموعہ)

ارمان شمسی

۱۵۰ روپے

۸۵، خواجہ دیوان فرسٹ لین (لال باغ) پانچویں منزل، ڈھاکہ۔ ۱۲۱۱، بنگلہ دیش

اُردو اور انگریزی کی دو عظیم لغات کا تذکرہ

ڈاکٹر رؤف پاریکھ

جدید شاعری کے معتبر شاعر

سیموئیل جانسن کی مرتبہ ''اے ڈکشنری اوف دی انگلش لینگویج '' کو انگریزی زبان کی اہم لغات میں شمار کیا جاتا ہے۔ انھوں نے تنِ تنہا نو برسوں کی محنتِ شاقہ کے بعد دو جلدوں پر مبنی یہ لغت مرتب کی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۷۵۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے کہیں کہیں اپنی حسِ مزاح کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے۔ مثلاً اپنی لغت میں ''لغت نویس'' کی تشریح کچھ یوں کی: ''لغت لکھنے والا، بھاڑے کا ایک بے ضرر ٹٹّو''۔

ظاہر ہے کہ وہ خود اپنی حالتِ زار پر تبصرہ کر رہے تھے کہ مشکل وقت میں کسی نے اُن کا ساتھ نہیں دیا لیکن جب لغت تیار ہوگئی تو بہت سے لوگ اُن کا ''سرپرست'' بننے کو تیار ہوگئے۔ انھوں نے اپنی لغت میں لفظ ''سرپرست'' کی بھی دل چسپ تشریح کی ہے جو یہ ہے: ''ایک گھٹیا ا? دمی جو خوشامد کا معاوضہ بدتمیزی کی شکل میں دیتا ہے''۔ بظاہر تو لگتا ہے کہ سیموئیل جانسن ایک دل جلا تھا لیکن یہ تشریحات بہر حال کچھ نہ کچھ سچائی لیے ہوئے ضرور ہیں۔

اوکسفرڈ کی بڑی لغت کی اشاعت سے پہلے سیموئیل جانسن کی لغت کو انگریزی زبان میں مستند ترین لغت کہا جاتا تھا کیونکہ اس میں الفاظ کے استعمال کی سند بھی مثالیہ اقتباسات سے دی گئی ہے۔ اوکسفرڈ کی بڑی لغت کا پورا نام ''اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری'' ہے اور بیس جلدوں پر مشتمل اس لغت کو انگریزی زبان کی ضخیم ترین لغت ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ یہ دنیائے لغت نویسی میں ایک عظیم کارنامہ سمجھی جاتی ہے۔ پہلے ایڈیشن کی دس جلدیں تھیں جن کی تجلید بارہ جلدں میں کی گئی۔ اس کی اشاعت کا آغاز ۱۸۸۴ء میں ہوا اور یہ کام ۱۹۲۸ء میں مکمل ہوا۔ گویا اس میں بظاہر چوالیس سال لگے۔ لیکن درحقیقت اوکسفرڈ کی اس بڑی لغت پر کام کا آغاز ۱۸۶۰ء میں ہوگیا تھا جب اس لغت کی تیاری کے اصول اور رہ نما خطوط مرتب کیے گئے۔ طے کیا گیا تھا کہ اس میں انگریزی زبان کا ہر لفظ ہوگا اور ہر لفظ کی سند انگریزی کے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی تحریروں سے دی جائے گی۔ نیز اس میں ہر لفظ کے مختلف زمانوں میں بدلتے ہوئے مفاہیم کی بھی وضاحت اسناد کی مدد سے کی جائے گی۔ یہ مشکل ترین کام ہو تو گیا لیکن اس میں اڑسٹھ برس لگ گئے۔ اڑسٹھ برس کہنا تو بڑا ا? سان ہے لیکن کوئی کر کے دیکھے کہ اڑسٹھ برس تک مسلسل کسی کام میں لگے رہنا، جس کی فوری تکمیل کے کوئی آثار بھی نہ ہوں، کتنا مشکل ہے۔ سائمن ونچسٹر نے اس لغت کی دل چسپ تاریخ پر پوری ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کے مطابق اوکسفرڈ کی اس عظیم لغت کا دوسرا اضافہ شدہ ایڈیشن ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا جس کی بیس جلدیں ہیں۔ اس کے کُل صفحات کی تعداد اکیس ہزار سات سو اٹھائیس ہے اور اس میں چھے لاکھ سولہ ہزار سے زیادہ اندراجات ہیں (درست املا ''چھ'' نہیں ''چھے'' ہے)۔

اوکسفرڈ کی بڑی لغت جیسی بسیط و عظیم لغات دنیا کی کم زبانوں میں ہیں۔ اطالوی، جرمن اور فرانسیسی زبانوں میں ایسی ضخیم اور کثیر جلدی لغات موجود ہیں۔ عربی کی معروف و مستند لغات میں صحاح، لسان العرب اور القاموس وغیرہ شامل ہیں۔ فارسی کی ضخیم اور کثیر جلدی لغات میں فرہنگِ ا? نندراج، دہخدا اور بعض دیگر لغات کا نام نمایاں ہے۔

اوکسفرڈ کی بڑی لغت کے نمونے پر اردو میں بھی ایک ایسی بسیط لغت مرتب کرنے کے منصوبہ بنایا گیا جس میں اردو زبان کا ہر لفظ ہو۔ اس کام کا آغاز ۱۹۵۸ء میں ہوا جب اس مقصد کے لیے حکومتِ پاکستان نے ایک ادارہ ترقیٔ اردو بورڈ کے نام سے قائم کیا۔ بعدازاں اس کا نام اردو لغت بورڈ کر دیا گیا۔ بورڈ کی لغت اردو کی ضخیم ترین اور مستند ترین لغت ہے۔ اس کی بائیس جلدیں ہیں جن میں ادبی مآخذ سے الفاظ کے استعمال کی سندیں بھی دی گئی ہیں۔ ایک محتاط اندازہ ہے کہ بورڈ کی اردو لغت کے اندراجات کی تعداد دو لاکھ کے لگ بھگ ہوگی۔ اوکسفرڈ کی بڑی لغت کے مقابلے میں جس کی تیاری میں اڑسٹھ سال لگے تھے اردو لغت کا یہ کام باون برسوں میں مکمل ہوگیا اور اس پر اردو لغت بورڈ کے عملے کی جتنی تحسین کی جائے کم ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق بورڈ کی لغت کے پہلے مدیرِ اعلیٰ تھے اور عبدالحفیظ کاردار (ہمارے مشہور کرکٹر) بورڈ کے پہلے معتمد (یعنی سکیرٹری)۔ بورڈ کے پہلے صدر ممتاز حسن تھے اور شائستہ اکرام اللہ نائب صدر۔ جوش ملیح ا? بادی کو بورڈ میں ادبی مشیر کے طور پر مقرر کیا گیا۔ عترت حسین زبیری، ڈاکٹر شہید اللہ، رازق الخیری، سید عبداللہ، ابواللیث صدیقی، شان الحق حقی اور حسام الدین راشدی بورڈ کے ارکان تھے۔ شان الحق حقی کو ۹۵۹۱ء میں بورڈ کا معتمد مقرر کیا گیا۔ بابائے اردو اس وقت خاصے ضعیف ہو چکے تھے اور ۱۶۹۱ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔ جس کے بعد معتمد کے علاوہ مدیرِ اعلیٰ کی ذمے داری بھی عملاً شان الحق حقی نے اعزازی طور پر سترہ سال تک ادا کی۔ حقی صاحب نے ارکان کے مشورے سے اس لغت کے بنیادی اصول اور رہنما خطوط بھی طے کیے جن پر ابتدائی کام بابائے اردو کر چکے تھے۔ بورڈ نے حقی صاحب کی ادارت میں ایک رسالہ ''اردو نامہ'' جاری کیا جس میں زبان، لغت اور لسانیات پر اہم اور مستند مضامین شائع ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان کی تاریخ میں زبان، لسانیات اور لغت کے موضوع پر ''اردو نامہ'' سے زیادہ وقیع اور معتبر رسالہ اور کوئی شائع نہیں ہوا۔ اس کے چون (۵۴) شمارے شائع ہوئے۔

’’اُردو نامہ‘‘ میں بورڈ کی لغت کے نمونے کے صفحات شائع ہوتے تھے جن پر پاکستان اور ہندوستان کے چوٹی کے اہلِ قلم اور اہلِ علم اپنی رائے دیتے تھے اور ان ا؟ را کی روشنی میں لغت کو بہتر بنانے کے لیے اس میں ترمیم و اضافہ کیا جاتا تھا۔ حقی صاحب کا خیال تھا کہ پہلے لغت کی تمام جلدیں مکمل ہو جائیں پھر اس کی طباعت کا آغاز کیا جائے۔ لیکن اس کام میں ظاہر ہے کہ بہت وقت لگ رہا تھا۔ جب انگلستان جیسے ملک میں ایسی بسیط لغت کی مکمل تیاری میں اڑسٹھ برس لگ گئے تو ہمارے ملک کے کم وسائل کے پیشِ نظر یقینی طور پر زیادہ وقت لگتا۔ لیکن شائقین کا اشتیاق اور حکومت کی بے صبری بڑھتی گئی کیونکہ ہر سال بورڈ کے لیے رقومات کی فراہمی حکومت کی ذمے داری تھی اور کسی عملی نتیجے (یعنی کسی جِلد کی اشاعت) کے بغیر رقم کی فراہمی جاری رکھنا سرکاری نظام میں مشکل ہوتا ہے۔ آخرِ کار طے ہوا کہ پہلی جلد کی طباعت کا آغاز کر دیا جائے۔ حقی صاحب نے پہلی جلد کا حتمی مسودہ تیار کر لیا تھا۔ ا؟ گے کی جلدوں کا بھی خاصا حصہ تیار تھا۔ لیکن حقی صاحب نے اختلافات کی بنا پر ۱۹۷۶ء میں بورڈ سے استعفا دے دیا (درست املا استعفا ہے، نا کہ استعفیٰ)۔

شان الحق حقی کے بعد حکومت نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کو اردو لغت بورڈ کا مدیرِ اعلیٰ مقرر کیا اور انھوں نے نہ صرف ۱۹۷۷ء میں پہلی جلد شائع کر دی بلکہ اُن کی ادارت میں اگلی پانچ جلدیں بھی ۱۹۸۴ تک منظرِ عام پر آ گئیں۔ ان کے بعد ڈاکٹر فرمان فتح پوری مدیرِ اعلیٰ بنائے گئے اور انھوں نے لغت پر کام بہت تیز کر دیا اور اگلے دس گیارہ برسوں میں لغت کی دس جلدیں شائع کر دیں۔ اس طرح ء ۱۹۹۵ تک اردو لغت بورڈ کی لغت کی سولہ جلدیں شائع ہو چکی تھیں۔ بعد میں وقفے وقفے سے اس کی جلدیں شائع ہوتی رہیں اور مختلف مدیرانِ اعلی نے اس پر کام کیا لیکن شان الحق حقی، ابواللیث صدیقی اور فرمان فتح پوری نے اس کی تدوین و اشاعت میں اہم ترین کردار ادا کیا۔ اگر اسے خود ستائی پر محمول نہ کیا جائے تو یہ عرض کرنے کی جسارت کروں کہ یہ عاجز طالب علم بھی اردو لغت بورڈ کا چار سال مدیرِ اعلیٰ رہا اور اس کی ادارت میں تین جِلدیں شائع ہوئیں۔ قصہ مختصر، اردو کی اس ضخیم ترین لغت کی آخری اور بائیسویں جلد ۲۰۱۰ میں منظرِ عام پر آئی۔ اس طرح اردو لغت نویسی کا یہ عظیم کام مکمل ہوا۔ باون سال کی محنت ٹھکانے لگی۔ اردو کی ایک ضخیم اور پانچ جِلدوں پر مبنی لغت پر ہندوستان میں بھی کام شروع ہوا تھا لیکن وہ منصوبہ نامکمل رہا اور اس کی ایک بھی جلد شائع نہ ہو سکی۔ اس طرح اردو کی ضخیم ترین لغت کی تدوین و اشاعت کا اعزاز پاکستان کو حاصل ہوا۔

لیکن اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس لغت کا دوسرا ترمیم شدہ اور اضافہ شدہ ایڈیشن شائع کیا جائے کیونکہ لغت کا کام کبھی مکمل نہیں ہوتا۔ زبان بدلتی رہتی ہے، الفاظ معنی بدلتے ہیں، زبان میں نئے الفاظ شامل ہوتے ہیں اور اس طرح ایک نئی اور تازہ تر لغت کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔ کہتے ہیں کہ دس بیس برس کے بعد لغت پرانی ہو جاتی ہے اور پچاس ساٹھ سال کے بعد از کار رفتہ۔ اسی لیے انگریزی لغات کے نئے اور اضافہ شدہ ایڈیشن ا؟ تے رہتے ہیں۔ اُمید ہے کہ حکومتِ پاکستان اُردو کی اس عظیم لغت کے نئے ایڈیشن کی تیاری پر غور کرے گی۔ ●●

تفہیم

(مضامین)

ڈاکٹر صالحہ رشید

9935040160

: صدر شعبۂ عربی و فارسی، الہٰ آباد یونیورسٹی، الہٰ آباد، یو پی

۱۶۸

ڈیمائی

عرشیہ پبلیکیشنز، دہلی

’’تفہیم‘‘ ڈاکٹر صالحہ رشید کے مختلف مواقع پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ ہے، گلدستہ ہے۔ چودہ مضامین پر مشتمل یہ مجموعہ اپنے عنوانات ہی سے اپنی افادیت اور اہمیت کا پتہ دیتا ہے۔ عنوانات ہیں:

1 ہندوستان میں پالی، عربی، فارسی و اردو۔ کل اور آج
2 فارسی صحافت کا ارتقاء اور ہندوستانی فارسی ادب میں اس کے نقوش
3 امام محمد غزالی اور کیمیائے سعادت
4 تاریخ اکبری۔ عہد اکبری کی ایک کم معروف تاریخ
5 سفینۃ الاولیاء میں ذکر عارفات الصالحات اور رابعہ بصری
6 ایرانی تصوف اور مولانا جلال الدین رومی
7 تیرہویں صدی کی ایک خاتون حکمران۔ رضیہ سلطان
8 شاہنامۂ فردوسی کے چند نسوانی کردار علامہ شبلی نعمانی کی قلم سے
9 نمایندۂ نسوان ایرانی۔ سیمین بہبہانی
10 منٹو کے ہمعصر چند فارسی افسانہ نگار
11 اردو اصناف ادب پر فارسی کے اثرات
12 مولوی ذکاء اللہ۔ الہ آباد یونیورسٹی کے پہلے فارسی استاد
13 ڈاکٹر غلام سرور۔ فارسی کی ایک کثیر التصانیف شخصیت
14 آشوب دہلی اور دستنبو

جتیندر بِلّو کی سوانح عمری - دیکھو ہم نے کیسے بسر کی

دیپک بُدکی

بٹوارے کے بعد پاکستان اور ہندوستان سے لاکھوں مہاجرین نے روزگار کی خاطر قانونی وغیر قانونی طور پر سمندر پار جانے کی کوشش کی اور اس میں اکثر وبیشتر کامیاب رہے۔اس طرح برطانیہ، امریکہ اور دیگر یوروپی ممالک میں اردو کی بستیاں بس گئیں۔ یہاں تک کہ برطانیہ کے ساؤتھ ہال کو لوگ چھوٹا ہندوستان کہنے لگے۔اس بارے میں جتیندر بِلّو فرماتے ہیں:

”یہ المیہ صرف میرا ہی نہیں پچاس لاکھ تارکین وطن بھی اس سے دوچار ہیں۔ انھوں نے برطانوی پاسپورٹ حاصل کرکے یہاں کی شہریت ضرور پائی ہے لیکن اپنا چھوڑا ہوا دیش ان کو رو رو کر یاد آتا ہے۔“

مذکورہ بستیوں سے کئی ایسے ادیب اور شاعر سامنے آئے ہیں جنھوں نے اردو ادب میں خاصا نام کمایا۔جتیندر بِلّو انھی میں سے ایک ہیں جنھوں نے افسانہ وناول نگاری میں اپنی ایک الگ چھاپ چھوڑ دی۔اب وہ چند برسوں سے اپنی زندگی کے سفر کو سہ جلدی سوانح عمری کی صورت میں قلمبند کرنے میں جُٹے ہوئے ہیں۔ دو جلدیں تو پہلے ہی شائع ہو چکی ہیں جبکہ اس ٹرائیلوجی کی تیسری جلد منصۂ شہود پر نمودار ہونے والی ہے۔ عام طور پر یہ خودنوشتیں رائٹر کی زندگی کے نشیب وفراز اور ان سے جوجھنے کی داستاں بن جاتی ہیں مگر ساتھ ہی کچھ دوستوں کی شخصیت کو بھی اجاگر کرتی ہیں جن میں زیادہ تر ادیب اور شاعر ہوتے ہیں۔تاہم چند ایک خودنوشتیں نہ صرف ذاتی زندگی کا آئینہ بن جاتی ہیں بلکہ سوانح نگار کے ماحول، تاریخ، اسفار، ملکی وغیر ملکی تہذیب اور ثقافت کو منعکس کرنے میں بھی کامیاب ہوتی ہیں۔ عموماً یہ سوانح عمریاں توقیتی (Chronological) ترتیب سے لکھی جاتی ہیں اور ان میں موضوعیت (Subjectivity) کارفرما رہتی ہے۔اردو کے معروف افسانہ و ناول نگار، جتیندر بِلّو نے بھی ادبی کینواس پر اپنی زندگی کے رنگ بکھیر کر ایک مونتاژ تیار کیا ہے جس میں زمانی یا مکانی ربط تو نہیں ملتا البتہ یہ کولاژ ان کی زندگی کا جیتا جاگتا آئینہ بن کر سامنے آتا ہے۔جتیندر بِلّو کسی لاگ لپیٹ کے بغیر اور بنا کسی خوف وڈر کے اپنے موضوعات، کردار اور واقعات پیش کرتے ہیں اور اس بات کی کبھی فکر نہیں کرتے کہ کہیں ان سے آبگینوں کو ٹھیس تو نہیں لگ جائے گی۔ انھوں نے تہذیبی تصادم، نسلی امتیاز اور جنسی مسائل و کجرویوں پر بہت ہی خوبصورت افسانے تحریر کیے ہیں۔ ان کے یہاں اکثر روایت شکنی اور تجرباتی تحریریں ملتی ہیں۔ بہت عرصہ تک وہ جدیدیت سے جڑے رہے مگر بعد میں اس سے بدظن ہو گئے پھر بھی سوزِ دروں اور داخلی سچائی ان کی شخصیت کا حصہ بن کر رہ گئے۔ان کی یہی بے باکی زیرِ نظر خودنوشت میں بھی ملتی ہے۔

جاذب اور پُرکشش شخصیت کے مالک جتیندر بِلّو کی زندگی کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہی۔انھیں قدم قدم پر عدم استحکام کا سامنا کرنا پڑا۔۱۸؍نومبر ۱۹۳۷ء کو کریم پورہ، پشاور (پاکستان) میں جنمے جتیندر دیولا نبہ کو دس سال کی عمر میں تقسیم ملک کے باعث ہجرت کا کرب جھیلنا پڑا۔اس سانحے کی صعوبتوں کو انھوں نے خودنوشت میں مختصراً بیان کیا ہے کہ کس طرح ان کے گھر میں یکا یک افراتفری پھیل گئی لیکن خوش قسمتی سے ایک رشتے دار کی مدد سے سارا کنبہ ہوائی جہاز سے سرحد پار کرنے میں کامیاب ہو گیا۔جتیندر بِلّو کا بچپن دہلی میں گزرا جہاں انھوں نے راجندر نگر کے سلوان سکول میں دسویں جماعت تک پڑھائی کر لی اور پھر دہلی یونیورسٹی سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ بِلّو اپنے آپ کو ذہین طالب علم نہیں سمجھتے تھے اور زیادہ تر وقت اپنے دوستوں کے ہمراہ آوارہ گردی میں صرف کرتے تھے۔سن شعور ہی میں سگریٹ نوشی کی لت پڑ گئی تھی۔لندن میں رہ کر بھی سوٹ اور ٹائی پہننا پسند نہیں کرتے تھے۔ان کے پاؤں کا چکر ان کو پشاور سے انبالہ، دہلی، جالندھر اور پھر دوبارہ دہلی لے چلا۔دلّی سے نقل مکانی کرکے وہ اپنے بڑے بھائیوں کے پاس ممبئی چلے گئے اور بالی وُڈ کے ساتھ جڑ گئے جہاں وہ معاون ہدایت کار کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ بالی وُڈ کی زندگی کے بارے میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ پریم چند کے ناول ’غبن‘ کی فلم سازی کے دوران انھیں ’ٹھکانہ‘ اور ’طاقت‘ کے فلم ساز راج گروور سے قربت حاصل ہوئی جس کی یادداشتوں کی کتاب کے اجرا کا قصہ رقم کیا گیا ہے۔فلم نگری ممبئی میں رہ کر بھی بِلّو کی نظریں انگلینڈ پر جمی ہوئی تھیں۔ایک بار جا کر مانچسٹر میں پانچ سال گزارے اور کچھ سرمایہ اکٹھا کرکے واپس اپنے وطن آگئے مگر سرمایہ ختم ہوتے ہی بے روزگاری کا احساس کچوکنے لگا۔انھی دنوں ایمرجنسی بھی نافذ ہو گئی اور ملک کے حالات بد سے بدتر ہو گئے۔اس لیے ۱۹۷۶ء میں ذاتی کرب کے باعث سمندر پار کرکے لندن میں جا بسے جہاں سہولیات کی دستیابی کے پیش نظر انھوں نے وہاں کی شہریت قبول کی۔تاہم دو تین برسوں کے بعد وہ لندن سے اپنے بھائیوں کو ملنے کے لیے ممبئی آتے رہے۔اسی دوران ان کی دوستی انور قمر سے ہوئی جس کا اختتام دردناک رہا۔ممبئی میں ناشر الیاس شوقی سے بھی مراسم رہے۔

ہجرت کے بعد جتیندر بِلّو لندن میں ’انڈیا ٹی سینٹر‘ میں ملازم ہو گئے۔ بعد میں ایک بسکٹ فیکٹری ’میکوٹیز‘ (Mcvities) میں بحیثیت ’فیڈر‘ کے نائٹ شفٹ میں کام کرتے رہے جس کا ان کی صحت پر کافی اثر پڑا۔یہاں انھیں کئی ناجائز تارکین وطن سے واسطہ پڑا جن میں بلوچستان کا مجاہد آزادی علی اختر بھی تھا جسے پولیس اٹھا کر لے گئی۔ ایک مہرباں کی صلاح پر انھوں نے کیٹرنگ کا ایک مختصر المدتی کورس پاس کیا اور اس کے بعد ایک ریسٹوران ’گیلارڈ‘ میں فلور منیجر کی نوکری کرنے لگے۔ انھوں نے اپنی بیوی پولکا کے ساتھ مغربی

لندن کے مخلوط علاقے 'ایلپرٹن' میں چار سال گزارے مگر وہاں پر ڈرگس (Drugs) اور مگنگ (Mugging) کی وارداتیں بڑھنے کے سبب انھیں وہ علاقہ چھوڑنا پڑا اور پھر مہنگے علاقے 'ایلنگ' کا رخ کرنا پڑا۔ یہاں انھیں کالونیل ذہنیت کے انگریزوں سے واسطہ پڑا جو برتری کے احساس میں بدمست رہتے تھے۔ سوانح نگار نے ان کالونیل ذہنیت کے لوگوں کے رہن سہن، رویے اور مذہبی تقریبات پر روشنی ڈالی ہے۔ بقول بلّو یہ تہذیبوں کا تصادم تھا، مشرقی لوگ جہاں 'عقیدے کے دور' Age of Faith میں جی رہے تھے وہیں مغربی لوگ 'عقلیت کے دور' Age of Reason میں جینا پسند کرتے تھے جس کے باعث انھوں نے بے انتہا مادی واقتصادی ترقی کر لی۔ بلّو کو اس بات کا افسوس رہا کہ کالی نسل کے سبب انھیں کرسمس یا بوکسنگ ڈے پر ان محفلوں میں مدعو نہیں کیا جاتا تھا۔ انھوں نے افسانہ 'جزیرہ' میں اس موضوع کی باریک بینی سے عکاسی کی ہے کہ کیسے ایک چھوٹا سا جزیرہ، برطانیہ، دنیا بھر کے ممالک پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہاں اپنے طرز کی حکومت اور جمہوریت کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب ہوا۔ بقول گوپی چند نارنگ 'جزیرہ ان کی شاہکار کہانی ہے۔'' اس افسانے کو ساہتیہ اکادمی نے ترجمہ کر کے انتھالوجی میں شامل کر لیا ہے۔

جتیندر بلو کی ادبی زندگی کی شروعات ۱۹۶۵ء میں افسانہ 'جعلی نوٹ' سے ہوئی جو ماہنامہ 'شمع' میں شائع ہوئی۔ ابتدا میں بلّو بیدل کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا مگر بعد میں جتیندر بلّو کا قلمی نام اختیار کر لیا۔ پڑھنے لکھنے کا چسکا انھیں جوانی ہی میں لگا تھا مگر سچ تو یہ ہے کہ ادب کے ساتھ ان کی دلچسپی فلم انڈسٹری میں داخل ہونے کے بعد پیدا ہوئی۔ ممبئی کے قیام کے دوران وہ مکتبہ جامعہ کے پاس ریستورانوں میں ادبی نشستوں میں حصہ لیتے تھے جہاں ان کی ملاقاتیں انور خان، باقر مہدی، ندا فاضلی، سریندر پرکاش، فاضل، یوسف ناظر، سلام بن رزاق، ابراہیم نظیر، یعقوب راہی وغیرہ سے ہوتی رہیں۔ ان محفلوں کے اختتام پر ان میں سے کچھ دوست میخانے کی شرن لیتے اور وہاں بھی ادبی بحث ومباحث ہوتے جو زیادہ تر جدیدیت اور شمس الرحمن فاروقی پر مرکوز رہتے۔ البتہ باقر مہدی اپنی تبحر علمی کا مظاہرہ کرتے اور مابعد جدید زمانے میں جدیدیت کی بات کرنے کو کم عقلی گردانتے۔ اس کے برعکس ندا فاضلی جدیدیت کو ترقی پسند تحریک کی توسیع مانتے تھے۔ یہ وہ دن تھے جب جدیدیت اپنے عروج پر تھی۔ انجام کار جتیندر بلّو کا اس تحریک سے بچ پانا مشکل تھا۔ وہ بہت عرصہ تک جدیدیت اور علامتی اظہار سے جڑے رہے مگر بعد میں کہانی پن اور بیانیہ کی جانب لوٹ آئے۔ ان کا اسلوب بھی اسی جدیدیت کے سبب غائب متکلم سے واحد متکلم میں بدل گیا۔ بقول جتیندر بلّو بڑا ادب تخلیق کرنے کے لیے داخلی سچائیوں کا ہونا ضروری ہے۔ ترقی پسندوں سے تو خیر پہلے ہی سے خار کھائے بیٹھے تھے۔ ترقی پسندوں اور کمیونسٹوں سے وہ پوچھتے رہے کہ انھوں نے ۱۹۶۸ء میں چیکوسلوواکیہ اور ۱۹۷۸ء میں افغانستان میں روسی جارحیت کے موقعے پر احتجاج کیوں نہیں کیا؟ دراصل ترقی پسند رائٹرس اس وقت بھی سوچتے تھے کہ ان کی تحریریں برصغیر میں انقلاب برپا کریں گی جبکہ اس تحریک نے کب کا دم توڑ دیا تھا۔ تاہم بلّو اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ کرشن چندر اور منٹو کی نگارشات نے انھیں کافی متاثر کیا ہے۔ ابتدا میں ان کی کہانیاں شمع، بیسویں صدی اور روبی میں چھپتی رہیں لیکن ندا فاضلی کے مشورے پر انھوں نے ادبی رسائل کو کہانیاں بھیجنا شروع کیا جو مقبولیت سے سرفراز ہوئیں۔ ان دنوں تین معروف رسالے، لکھنؤ سے شائع ہونے والا رسالہ 'کتاب' (مدیر عابد سہیل)، گیا سے شائع ہونے والا 'آہنگ' (مدیر کلام حیدری) اور الہ آباد سے شائع ہونے والا شمس الرحمن کا 'شب خون' ادبی حلقوں میں معتبر سمجھے جاتے تھے حالانکہ شب خون سب پر بھاری پڑ جاتا تھا۔ تقریباً ۵۵ سال کی ادبی زندگی میں انھوں نے ایک سو سے زائد کہانیاں لکھی ہیں اور سات افسانوی مجموعے وتین ناول شائع کیے ہیں۔ جتیندر بلو کی تصانیف جو منظر عام پر آچکی ہیں یوں ہیں: پرائی دھرتی اپنے لوگ (ناول، ۱۹۷۷ء)، پہچان کی نوک پر (افسانے، ۱۹۸۶ء)، مہانگر (ناول ۱۹۹۰ء)، جزیرہ (افسانے ۱۹۹۴ء)، نئے دیس میں (افسانے ۱۹۹۸ء)، انجانا کھیل (۲۰۰۱ء)، وشواس گھات (ناول ۲۰۰۳ء)، چکّر (افسانے ۲۰۰۷ء)، درد کی حد سے پرے (افسانے ۲۰۱۰ء)، اور آخری پڑاؤ (۲۰۱۳ء)۔ بلّو کے یہاں موضوعات کی بوقلمونی ملتی ہے جیسے ہجرت کی کلفتیں، ہندوستانی معاشرے کی بدعتیں، یورپی ممالک میں ایشیائی وافریقی باشندوں سے بدسلوکی وغیرہ۔ ان کے خیال میں ہندوستانی اور یوروپی معاشرے الگ اور متضاد ہیں اور مشرقی ومغربی تہذیبوں کا ہمیشہ تصادم رہا ہے۔ بقول جتیندر بلّو ہر مہاجر ابتدا میں اپنی کھوج میں جٹا رہتا ہے، پھر اپنے احساسات وجذبات کا اظہار کرتا ہے اور آخر میں اپنی خواہشات کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔

جتیندر بلّو دوست نواز ہیں، پہلے ممبئی میں اور پھر لندن میں انھوں نے کئی ادبی دوست بنائے جن کا ذکر وہ زیر نظر سوانح میں کرتے ہیں۔ ان میں سے کچھ ادیبوں کے ساتھ کافی قربت حاصل ہوئی جبکہ باقی ادیبوں کے ساتھ محض رسمی رابطہ رہا۔ زیر نظر سوانح میں انھوں نے اپنے دوستوں کے مختصر خاکے بھی پیش کیے ہیں جن سے ان کی شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ حالانکہ بلّو نے اپنے دوستوں کے مثبت ومنفی ہر دو پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے مگر منٹو کی طرح وہ تلخی اور ترشی سے گریز کرتے ہیں۔ پہلے دور میں لندن میں ان کی ملاقات ساقی فاروقی، عبداللہ حسین، سریندر کوچھڑ اور راجندر سنگھ بیدی سے ہوئی تھی۔ ساقی فاروقی کے بارے میں انھوں نے ایک مضمون بہ عنوان 'ایک شاعر کا المیہ' لکھا ہے۔ دوسرے دور میں جب وہ گیلارڈ میں کام کرتے تھے تو ریستوراں کے نزدیک ہی 'اردو مرکز' واقع تھا جو پاکستانی برادری اور اردو زبان کا کلچرل فرنٹ تھا۔ وہاں پر ان کی ملاقات افتخار عارف، الطاف گوہر، مشتاق احمد یوسفی سے ہوئی۔ مرکز میں ہندوستان کے مشہور ادیبوں کو بھی مدعو کیا جاتا تھا۔ اردو مرکز کی وساطت سے وہ ماہر لسانیات رالف رسل جنھیں اردو سے بے حد محبت تھی، سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بلّو کے ناول 'پرائی دھرتی، اپنے لوگ' کی تعریف کی۔ چنانچہ ان سے مل کر بلّو کو احساس ہوا کہ:

''انگریزی قوم میں کتنا ڈسپلن ہے۔ یہ لوگ ہر کام وقت کے مطابق کرتے ہیں۔ اسے بھرپور اہمیت دیتے ہیں اور اسے ضائع کرنا جرم سمجھتے ہیں۔''

اردو مرکز میں اور بھی کئی شخصیتوں سے ملاقات ہوئی جن کے نام یوں ہیں۔ بخش لائلپوری، ابرار ترمذی (پینٹر، فوٹوگرافر اور نثر نگار)، برطانیہ کے بابائے اردو محمود ہاشمی (ناول 'کشمیر اُداس ہے')، نجمہ عثمانی، ستیہ پال آنند، ساقی فاروقی، محمد حمید شاہد (ناول 'مٹی آدم کھاتی ہے'، افسانوی مجموعے 'جنم جہنم'، 'مرگ زار'، 'بند آنکھوں سے')، حسین مشیر علوی (نظم گو)، قیصر تمکین (۶ افسانوی مجموعے، متنازعہ فیہ 'تنقید کی موت') حیدر طباطبائی اور مقصود الٰہی شیخ۔ لندن سے ان دنوں دو رسالے بعنوان 'ساحل' اور 'پرواز' چھپتے تھے۔ بعد میں حیدر طباطبائی نے رسالہ 'شہرزاد' نکالا۔ بقول جتیندر بلّو مقصود الٰہی شیخ نے اردو کی نئی مغربی بستیوں کے قلم کاروں کی ہمت افزائی اور ان کی نگارشات کو اردو حلقے تک پہنچانے کے لیے ایک ضخیم میگزین 'مخزن' نکالا جس کے ۱۰ شمارے چھپ گئے۔ ان میں بلّو کی کئی کہانیاں شائع ہوئیں اور داد تحسین پائیں۔ بقول بلّو:

"اسی سبب مقصود الٰہی شیخ نے مخزن کی اشاعت کا منصوبہ بنایا تھا تا کہ مغرب اور مشرق کے درمیان ادبی، ثقافتی اور تاریخی پُل تعمیر کیے جائیں۔"

جتیندر بلّو جہاں اردو کے مستقبل پر فکر مند ہیں وہیں وہ فروغ اردو کے لیے بنائی گئی اکادمیوں پر اپنی بے لاگ رائے یوں ظاہر کرتے ہیں:

"مجھے اکیڈیمیوں کے کردار اور ان کی اصلیت کا علم ہو چکا ہے۔ وہ کتاب کے معیار کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے بلکہ بندر بانٹ کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ اکیڈیمی کے اراکین شعرا و ادیبوں کے ساتھ ذاتی تعلقات کی بنا پر کیش کر رہے ہیں۔"

مزید ناقدین کے بارے میں فرماتے ہیں:

"ہمارے ناقدین کے ترازو میں کہیں کوئی گڑبڑ ضرور ہی ہے۔ ادبی منافقت کا احساس بھی الگ سے ہوتا ہے۔"

جتیندر بلّو کی سہ جلدی سوانح میں نہ صرف تقسیم وطن کا دلسوز منظر نامہ ملتا ہے بلکہ پسِ آزادی ہندوستان اور یوروپی ممالک میں تارک الوطن لوگوں کی کشمکش کا بیان بھی ملتا ہے۔ بلّو کی زباں کی روانی اور شگفتگی کہیں بھی بوجھل پن کا احساس ہونے نہیں دیتی۔ سوانح میں انھوں نے راست بیانیہ سے کام لیا ہے اور علامتی اظہار و استعاروں سے گریز کیا ہے۔ قاری کتاب کو شروع کر کے اس میں کھو جاتا ہے اور اختتام تک پہنچتے ہی دم لیتا ہے۔ انھوں نے قریباً ستّر سالوں کی تاریخی و تمدنی زندگی اور مشرقی و مغربی کلچرل تصادم کو اپنی سوانح عمری میں سمیٹ لیا ہے۔

مجموعی طور پر جتیندر بلّو کی تصنیف 'دیکھو ہم نے کیسے بسر کی' سوانحیاتی ادب میں ایک نیا اضافہ اور تجربہ ہے۔ وہ زندگی کی قاشوں کو ایک جگسا پزل کی مانند جوڑتے ہیں اور ان میں ایک فطری ربط اور ہم آہنگی پیدا کر کے اپنے اسلوب کے توسل سے دلچسپ بناتے ہیں۔ ان کے یہاں داخلی کرب بھی ملتا ہے اور معاشرے کی عکاسی بھی۔ وہ اپنے بارے میں اتنے ہی دردمند نظر آتے ہیں جتنے کہ اپنے سماج کے بارے میں۔ دراصل ان کی یہ خودنوشت ان کے دور کی داستان بن کر سامنے آتی ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ ٹرائیلوجی کی اس آخری جلد کی بھی اردو حلقے میں خوب پذیرائی ہوگی۔

گُناہِ کبیرہ

(ناول، ۲۰۱۹ء)

انِل ٹھکّر

دیپک بُدکی

۲۰۸ صفحات
تین سو پچاس روپے
موڈرن پبلشنگ ہاؤس، ۹، گولا مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی-۱۱۰۰۰۲

'گناہ کبیرہ' ہندوستان کے معاصر منظر نامے پر لکھا گیا ایک خوبصورت ناول ہے جو مسلم معاشرے کی خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے ساتھ ان کے باہمی تفاعل پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ آزادی کے بعد ہمارا ملک ایسے دور سے گزر رہا ہے جہاں ہر کسی کو اپنے رویے پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔ آئے روز گئو کشی، لو جہاد، قوم پرستی، ذات پات اور دیگر مسائل پر تنازع ہو رہا ہے جبکہ مفاد پرست اپنی اپنی روٹیاں سینک کر چلے جاتے ہیں۔ انل ٹھکّر نے اس ناول میں ایک دلت ہندو لڑکی اور ایک مسلمان لڑکے کے باہمی عشق کو، جس کو موجودہ دور میں حقارت سے 'لو جہاد' کا نام دیا گیا ہے، اس ناول کا کلیدی موضوع بنایا ہے جبکہ گئو رکھشا کے نام پر ہو رہے تشدد، دلتوں کو سیاسی آلہ کار بنانے کی سازش، لوگوں کے چنے ہوئے ممبران اسمبلی اور وزیروں کی کارستانی، معمولی باتوں پر دنگے کرانا اور اقلیتوں کو جانی و مالی نقصان پہنچانا وغیرہ کو ضمنی موضوعات بنایا ہے۔ تاہم انھوں نے سماج کے منفی کرداروں پر ہی مرتکز نہیں کیا ہے بلکہ کچھ مثبت جیالے کرداروں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو اپنی خوشیوں اور عیش و عشرت کی زندگی کو تیاگ کر غریب اور نادار لوگوں کی مدد کرنے میں اپنی زندگی وقف کرتے ہیں۔

انل ٹھکّر بنیادی طور پر سیکولر ذہن کے ادیب ہیں اور ڈرامہ و تھیٹر سے وابستہ ہونے کے سبب انھوں نے اس ناول میں ڈرامائیت، تعلیق اور تجسس پیدا کیا ہے۔ چتر بھج ٹھکّر (قلمی نام: انل ٹھکّر) ۷ رجون ۱۹۳۴ء کو کچھ، گجرات میں پیدا ہوئے، مصوری کی تعلیم پائی، ہندی، گجراتی، اردو اور مراٹھی میں دسترس حاصل کی اور بعد میں تھیٹر، اداکاری اور ہدایت کاری سے وابستہ ہو گئے۔ علاوہ ازیں وہ ادب کے ساتھ بھی جڑے رہے، ڈراموں کے تین مجموعے، افسانوں کے چار مجموعے اور چھ ناول قلمبند کیے جن کی ادبی حلقوں میں کافی پذیرائی ہوئی۔

زیرِ نظر ناول کرناٹک کے ہبلی شہر کے ماحول میں رچا بسا ہے جس

میں ایک قسمت کی ماری، اپنے ہی رشتے داروں سے استحصال زدہ غریب عورت، نصیبن، جس کا شوہر نور محمد گئو رکھشکوں کے ہاتھوں مارا جاتا ہے، ایک بچے کو جنم دیتی ہے جو پیدائشی بہرا اور گونگا ہوتا ہے۔ زندگی کے سفر میں اس کو کچھ ایسی عورتیں ملتی ہیں جو اس کی مدد کرتی ہیں اور جینے کے لیے اس کا حوصلہ بڑھاتی ہیں۔ بیٹا طارق لوگوں کی دیکھا دیکھی میں نماز پڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور غیر ارادی طور پر مسجد میں نماز کے دوران خلل پیدا کرتا ہے جس کے سبب لوگ اسے ناراض ہوتے ہیں البتہ ایک انسان دوست ڈاکٹر آفتاب عالم کو، جس نے ایک خیراتی ہسپتال کھول رکھا ہے، اس پر نظر پڑتی ہے اور وہ بغیر کسی معاوضے کے اس کا آپریشن کر کے اس کے کانوں میں ایک قیمتی آلہ نصب کرتا ہے جس سے طارق کا بہرہ پن ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ جستہ جستہ بولنے بھی لگتا ہے۔ دریں اثنا طارق کا ایک دوست رفیق احمد ایک غریب دلت لڑکی سے پیار کرنے کے لیے، لَو جہاد کی پاداش میں مارا جاتا ہے مگر اس کی معشوقہ جانکی لوگوں کی نظریں بچا کر طارق کی وساطت سے اس کی تربت پر عقیدت کے پھول اور مٹھی بھر مٹی ڈلوانے میں کامیاب ہوتی ہے۔ پولیس مجرموں کو پکڑنے میں آنا کانی کرتی ہے۔ اس سانحہ کا گہرا اثر طارق پر پڑتا ہے۔ جانکی فارموکولوجسٹ بن کر رفیق کی یاد میں ایک نئے عزم کے ساتھ غریبوں کے لیے ایک مسلم محلے میں کام کرنے کے لیے جٹ جاتی ہے۔ اس کام میں اسے ایک جین نوجوان، ڈاکٹر مہندر اور طارق کی رفاقت نصیب ہوتی ہے اور 'ہم نشین فاؤنڈیشن' وجود میں آتا ہے جہاں عام لوگوں کے لیے سستے داموں پر تشخیصِ امراض کی سہولت اور دوائیاں دستیاب ہوتی ہیں۔ بد قسمتی سے یہ ادارہ دوسرے ڈاکٹروں، جنھوں نے کروڑوں روپے خرچ کر کے ڈگریاں حاصل کی ہوتی ہیں اور اب اس کا سود سمیت غریب لاچار مریضوں سے وصول کرتے ہیں، کی آنکھوں کا کھٹکا بن جاتا ہے۔ جونہی ہم نشین فاؤنڈیشن کا ایک اور برانچ شہر میں کھل جاتا ہے، دو متاثر ڈاکٹروں کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ وہ ان تینوں افراد کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اور جب ناکام ہوتے ہیں تو ایک ریاستی ایم ایل اے/ وزیر کے توسط سے جانکی کی آبرو ریزی کی سکیم بناتے ہیں جس کی بھنک طارق کے کانوں میں پڑ جاتی ہے۔ چنانچہ جانکی نے اس کو راکھی باندھی ہوتی ہے اس لیے وہ اپنا فرض نبھاتا ہے اور وزیر پرشانت اور مذکورہ دو ڈاکٹروں، دتہ اور منگیش پر ہوٹل کے کمرے میں پستول سے گولیاں چلاتا ہے جس میں دو مر جاتے ہیں اور ایک ڈاکٹر کی ٹانگ کاٹی جاتی ہے۔ سیاسی ردِ عمل کے پیشِ نظر پولیس قاتل کا نام و پتہ صیغہ راز میں رکھتی ہے اور طارق کو دور جنگل میں انکاونٹر کر کے کام تمام کر دیتی ہے۔ غرض یہ کہ گاندھی کے اس دیش میں ناول نگار نے گندی سیاست اور پولیس کے گھنونے چہرے کو بے نقاب کیا ہے۔ نیز ملک میں ہو رہی افراتفری کو انھوں نے سیاست دانوں کی دین بتایا ہے۔

زیرِ نظر ناول میں کردار نگاری اور مکالمہ نگاری بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔ جانکی کی اولالعزمی اور رجائیت پسندی اسے امتیاز بخشتی ہے جبکہ طارق کا جذبہ، ایثار اور قربانی اس کو امر کر دیتی ہے۔ گاہے بہ گاہے منظر نگاری بھی بڑی ہنر مندی سے کی گئی ہے۔ زبان و بیاں عام فہم اور رواں ہے اور کہیں کہیں کردار کی نسبت سے مکالموں میں مقامی زبان استعمال کی گئی ہے۔

ناول میں سے چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے:

☆ ''نہیں، میرا مطلب ہے، تب کسی کو گاؤ ماتا کی یاد نہیں آتی۔ در بدر بھٹکنے چھوڑ دی جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص اسے رسی سے باندھ کر لے جاتا نظر آ جائے تو کچھ لوگوں کو گاؤ ماتا کے لیے ممتا جاگ اٹھتی ہے۔'' (ص ۴۹)

''دنیا کے کسی ملک میں بھی نفرت کی درآمد یا برآمد کے لیے کوئی قانون نہیں بنا۔ نفرت کبھی بھی، کسی بھی ریاست یا ملک میں آ جا سکتی ہے۔ اس کے لیے اسے کسی ملک کی سرحدیں روک نہیں سکتیں۔'' (ص ۵۳)

''ہند و پاک میں کام سے زیادہ خاطر داری میں وقت گزارا جاتا ہے۔'' (ص ۱۰۹)

''ہمیشہ یاد رکھو اللہ تعالیٰ نے ہمیں آنکھیں آگے کی طرف دی ہیں۔ کیوں؟ آگے دیکھنے کے لیے، مڑ کر دیکھنے کے لیے نہیں۔ ہمیں پاؤں دیے ہیں تا کہ ہم آگے بڑھ سکیں، پیچھے کی طرف نہیں۔'' (ص ۱۶۹)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ناول 'گناہِ کبیرہ' موجودہ دور کی عکاسی کرنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ معاصر مسئلہ جات کو ناول نگار نے بڑے اعتماد کے ساتھ بغیر کسی لاگ لپیٹ کے رقم کیا ہے جو قاری کو سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس ناول کا اردو حلقے میں پر تپاک خیر مقدم کیا جائے گا۔ ●●

طلسم انسانی جسم

پروفیسر حکیم سید ظل الرحمن

تاریخ عالم کے ابتدائی ترین عہد سے انسانی جسم کو مطالعہ کا موضوع بنایا گیا ہے۔ محض طب اور تشریح کے نقطہ نظر سے نہیں کائنات کے ہر ذرہ اور قدرت کی تخلیق کردہ ہر شے کی طرح جسم انسانی کے رموز جاننے کا انسان ہمیشہ مشتاق رہا۔ اپنے زمانے کے علم کے لحاظ سے وہ مظاہر فطرت کو غور سے دیکھتا اور ان کے حسن ظاہر کی ترکیبی آمیزش، رنگ ونکبت اور تخلیق کی دوسری بہت سی شکلوں اور صورتوں پر اس کی نظریں جاتیں۔ اس مطالعہ کو ہر دور میں فروغ ملتا رہا اور اسرار کائنات سے پردہ اٹھانے کی کوششیں شعوری وغیر شعوری طور پر جاری رہیں۔ قدیم ترین تہذیبوں ذہنوں کی اس کارفرمائی کا نمایاں طور پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔

یہاں یہ حقیقت بھی اپنی جگہہ بہت اہم ہے کہ اس جہاں رنگ و بو کے دوسرے رموز کو جاننے سے انسان کو پہلے بدن انسان کی تخلیق وترکیب کے بارے میں معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ پہلے بڑے اور ظاہری اور پھر رفتہ رفتہ باطنی اعضاء کی ساخت وہیئت کے باہمی رشتہ واعمال کا علم ہوتا گیا۔

یونانی فلاسفہ کے متعدد طبقوں میں فرقہ طبعی کے افراد نے نباتات، حیوانات اور بدن انسان کے مطالعہ اور تکوین کی حیران کن خوبیوں کے ذریعہ خالق کے وجود کا یقین حاصل کرنے کی کوشش کی۔ علمی طور پر غالباً یہ پہلی کوشش تھی جو قدرت کے شاہکار اور اس کے خلق کردہ کمال آفریں وجود کے تعلق سے انجام دی گئی۔

مسلمان علماء نے بھی وجود باری پر جو دلائل قائم کئے ہیں ان میں انسان کی حیرت انگیز تخلیق کو بطور خاص پیش کیا ہے۔ امام غزالیؒ کی الحکمة فی مخلوقات الله سے لے کر مولانا اشرف علی تھانوی کی المصالح العقلیه تک ایک سلسلہ ہے جس میں صانع حقیقی کے کمالات اور صنعت کے اعلیٰ ترین نمونہ کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ مشہور زمانہ طبیب محمد ابن زکریا الرازی نے بھی اپنی تصنیف کتاب في ان للعالم خالقاً حکیماً میں تشریحی حیثیت سے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے۔ اور آیت کریمہ خلقنا الانسان فی احسن تقویم کی توضیح وتشریح کی ہے۔

اس سلسلہ کی ایک تازہ ترین کوشش ڈاکٹر عبدالمعز شمس کی کتاب جسم و جاں ہے۔ 2014ء کی مطبوعہ اس کتاب میں جدید سائنس وطبی تحقیقات کی روشنی میں انسانی بدن کی تشریح ومنافع کے بارے میں دلچسپ انداز مں قیمتی معلومات پیش کی گئی ہیں۔ اس میں اعضاء کو بولتے ہوئے اور اپنی تشریحی ومنافعاتی خوبیوں کو گناتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔

طب وسائنس کے شہرت یافتہ کینیڈا میں مقیم مؤرخ محمد زکریا ورک نے طلسم انسانی جسم کے ذریعہ اس مطالعہ کو مزید وسعت وقعت عطا کی ہے۔ انہوں نے اس کتاب میں بڑی تحقیق وتفحص سے جدید ترقیات کے حوالہ سے انسانی بدن کی حیرت انگیز ترکیب، خلیات، انسجہ اور اور اعضاء کے بارے میں ناقابل یقین انکشافات پیش کئے ہیں۔ یہ حیران کن انکشافات ان کے عمیق مطالعہ کا ماحصل ہیں۔ انہوں نے واقعی جہاں اندر جہاں کی وسعتوں کی لامحدود یافتوں اور پراسرار و پوشیدہ رازوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ مواد غالباً دوسری زبانوں میں بھی یکجا طور پر دستیاب نہیں ہے۔ قلب، دماغ، ناک، کان، آنکھ، معدہ، جلد اور ہڈیوں کے پیچیدہ نظام نیز گردش خون، استقرار حمل، جنین، اور پھر آرگن ٹرانس پلانٹ، ڈی این اے، اور جین کے طلسم کے علاوہ دماغ کے تذکرہ میں انسانی نفسیات سے بھی بحث کی ہے۔ سائنس کی جدید تحقیقات کے سامنے آئے بغیر پہلے انہیں جاننا اور سمجھنا ممکن نہیں تھا۔ دوسری مخلوقات کی طرح انسانی جسم میں ایک وسیع جہاں آباد ہے۔ اسی لئے حکماء نے عالم اکبر کے مقابلہ میں اس کیلئے عالم اصغر کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

خدا کی خدائی اور اس کے وجود پر سب سے بڑا گواہ انسان کا بدن ہے۔ دنیا کے بلین ملین انسانوں کا بظاہر ایک جیسا نظر آنیوالا جسم اور مشترکہ طور پر پائے جانے والے اعضاء کے علاوہ آواز، سوچ، ذوق، ذہن، نفسیات یہاں تک کہ ہاتھ کی لکیروں، انگلیوں کے نشانات، چہرہ کے خدوخال کسی میں یکسانیت نہیں پائی جاتی۔ جڑواں افراد بھی شکل وصورت، نقش ونگار، ظاہری و باطنی خصوصیات اور عادات وخصائل میں ایک دوسرے سے مماثلت نہیں رکھتے۔ ہر شخص جذبات واحساسات میں جدا، اور مختلف اشکال وصور کا حامل، کوئی ایک ٹکسال میں ڈھلا نظر نہیں آتا۔ یہ قدرت کا ایک بڑا عجوبہ اور کمال آفریں نشان ہے۔ دنیا کی کوئی مشین اور کوئی ٹیکسال اس طرح الگ الگ اور جدا جدا نمونے نہیں نکال سکتی۔ انسانوں کا یہ اختلاف اور تغیر حالات ثبوت باری تعالیٰ کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

انما یخشی الله من عباده العلماء اللہ تعالیٰ سے سکالرز ہی ڈرتے ہیں کی تفسیر کے مطابق کسی بھی مضمون کے عظیم محقق کو اس مضمون کی گہرائی میں پہنچ کر پروردگار عالم کی معرفت کا جو یقین حاصل ہوتا ہے عام انسان اس کے لاکھویں حصے کا بھی ادراک نہیں کر سکتا۔ محققین اور سائنسدانوں کو ادنیٰ فہم اور عام لوگوں کے مقابلہ میں نہ صرف بدن انسان بلکہ ہر قدرتی ترکیب میں جو صنعت وکاریگری، گہرائی وگیرائی اور اندار در اندر پوشیدہ اسرار و طلسم کا نظارہ دیکھنے کو ملتا ہے وہ انہیں صانع حقیقی کے وجود کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور کرتا ہے۔ ظاہر میں جو جڑ، پتہ، کلی، پھول اور پھل دکھائی دے رہا ہے، علم

نباتات کے ماہر کو اس میں وہ کچھ بہت نظر آجاتا ہے جسے کوئی ناواقف، سادہ آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ ساری قدرتی تراکیب، حیوانات، نبادات، جمادات، جنگل، پہاڑ، آبشار، ارض وسما کی ہر شے شہادت دیتی نظر آتی ہے، کسی مافوق الفطرت ذات کی۔

نظام شمسی سے باہر ہزاروں سیارے منکشف ہو رہے ہیں۔ ماہرین فلکیات کے مطابق کتنے ہی سیارے ایسے ہیں جن کا درجہ حرارت اور جسامت زمین جیسی ہے، ان میں ممکنہ طور پر زندگی موجود ہو سکتی ہے۔ لاکھوں ستاروں کی تلاش اب تک ہو چکی ہے۔ اور کتنی ہی کہکشائیں اور کتنے ہی سیارے، اور کتنی ہی دنیائیں ابھی تک سامنے آنی باقی ہیں۔ رب المشرقین و رب المغربین اور رب المشارق و رب المغارب کا ظہور، سائنس اور انسانی ذہن کی نو بہ نو دریافتیں اور خیرہ نظر انکشافات عقل انسانی کیلئے حیران کن ہیں۔ قدرت کی عطا کردہ عدیم المثال قوتوں اور کائنات کے اسرار اور تخلیق حیات کی زرخیزی کا آنیوالے دنوں میں اور زیادہ بڑے پیمانے پر اظہار ہونا ہے۔

زکریا ورک کی کتاب طلسم انسانی جسم کے درج ذیل اقتباس سے انسانی جسم کے حیرت انگیز ساختوں اور ناقابل یقین اعداد و شمار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اندرونی کائنات کا یہ بیان حسابی زبان میں پیش کیا ہے۔

"انسان کی ایک مربع انچ کھال میں 19 ملین خلئے ہوتے ہیں۔ ان خلیوں میں ان کے علاوہ 60 بال، 90 تیل کے غدود، 19 خون کی شریانیں، 526 پسینے کے غدود، 19,000 سینسری سیل، موجود ہوتے ہیں۔ اوسط درجہ انسان کی کھال کا وزن 6 پاؤنڈ ہوتا ہے۔ انسانی خون کے ایک قطرے میں 250 ملین خون کے خلئے ہوتے ہیں۔ انسانی خون میں سرخ خلیوں کی تعداد 25 ٹریلین ہوتی ہے۔ ایک منفرد ریڈ بلڈ سیل اپنی 120 دن کی زندگی میں تین لاکھ مرتبہ جسم کا طواف کرتا ہے۔ مرد کے ایک کیوبک سینٹی میٹر خون میں 6.2 ملین ریڈ بلڈ سیل، اور عورت کے ایک کیوبک سینٹی میٹر خون میں 5.4 ملین ریڈ بلڈ سیل پائے جاتے ہیں۔ ایک سیکنڈ میں ہماری ہڈیوں کے گودے Bone Marrow کے اندر تین لاکھ ریڈ بلڈ سیل جنم لیتے ہیں۔۔۔ انسان کے ہر سیل کے مرکزے (نیوکلیئس) کے اندر 46 کمانی دار کروموسوم ہوتے ہیں۔ ان کروموسوم کے اندر پچاس ہزار سے ایک لاکھ جین پائے جاتے ہیں۔۔۔ انسان کا پورا جسم 75 ٹریلین 75,000, 000, 000, 000 خلیوں سے بنتا ہے۔ ایک بالغ انسان کے معدہ میں 35 بلین ہضم کرنیوالے غدود ہوتے ہیں۔ معدہ کے سیل ایک منٹ میں پانچ لاکھ خلئے دوبارہ پیدا کرتے ہیں۔۔۔ ایک بالغ آدمی کے منہ میں دس ہزار ذوقی کلیاں taste buds پائی جاتیں، ہر ذوقی کلی میں پچاس سینسری سیلز ہوتے ہیں۔"

اس طرح 29، ابواب پر مشتمل پوری کتاب انسانی جسم کے عجائب وغرائب کی ایک دلکش تصویر ہے، جس کو اس کے مؤلف نے خوبصورت ادبی پیرایہ میں پیش کیا ہے۔ زکریا ورک بہت باذوق، ذی علم اور صاحب نظر مؤرخ سائنس ہیں۔ انہوں نے جدید ترین دریافتوں اور معلومات کو ادبی حسن عطا کیا ہے۔ زبان کے خوبیوں کے ساتھ متعلقہ عضو کا بیان جس طرح حسب حال اشعار سے مزین ہے وہ ان کی خوش ذوقی اور اردو شعر و ادب سے ان کی خاص دلچسپی کا آئینہ ہے۔ جسمانی عجائبات کے حوالہ سے ایک عرصہ سے ان کا مطالعہ جاری تھا۔ اس موضوع سے متعلق ان کے مضامین برصغیر کے رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ انسانی جسم کی پیچیدگیوں اور قدرت کے انمول خزانوں کے اظہار کا کیا گیا ہے۔ آخر میں حصول صحت کے آسان نسخے دئے گئے ہیں۔

زکریا ورک کی اس سے قبل متعدد کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ ان میں 111 مسلمان سائنسداں (دو جلد)، سلام عبدالسلام، مسلمانوں کا نیوٹن، سوانح البیرونی، حکمائے اسلام، سائنس تاریخ کے آئینے میں قابل ذکر ہیں۔ مرکز فروغ سائنس علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ان کی دو کتابیں مسلمانوں کے سائنسی کارنامے، (2005) اور سوانح ابن رشد (2007) شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے راقم کی کتاب " قانون ابن سینا کے شارحین ومترجمین " کے انگریزی ترجمہ (2014) کے فرائض بھی انجام دئے ہیں۔ دسمبر 2013 میں انہوں نے "یورپ میں احیاء علوم پر اسلامی اثرات" کے عنوان سے علی گڑھ میں ابن سینا اکیڈمی میں یادگاری خطبہ عطا کیا تھا۔ ان کا یہ خطبہ اس مجموعہ میں شامل ہے جو ابن سینا یادگاری خطبات کے نام سے 2017 میں اکیڈمی سے شائع ہوا تھا۔

بدن انسان پر چونکا دینے والی اطلاعات پر مشتمل ان کی یہ کتاب اردو قارئین کی معلومات کے لئے خاص طور پر اضافہ کا باعث ہوگی۔ اور اسے بہت دلچسپی اور شوق سے پڑھا جائیگا۔

ہندوستان میں یہ کتاب عمار یاسر بنارس سے خریدی جا سکتی ہے۔ ●●

قومی کونسل علاقائی، قبائلی اور عالمی زبانوں کی نمائندہ تخلیقات کو اردو زبان میں شائع کرے گی: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تخلیقی ادب پینل کی آن لائن میٹنگ

نئی دہلی: ہندوستان میں سیکڑوں زبانیں بولی جاتی ہیں اور ہر زبان کا اپنا ادب ہے جس میں عمدہ شاعری اور بہترین کہانیاں لکھی جاتی ہیں، چونکہ اردو زبان اس ملک ہی نہیں، دنیا کی ایک نمایاں زبان ہے اس لیے ہماری خواہش ہے کہ اس زبان میں ہندوستان کی تمام زبانوں بالخصوص علاقائی وقبائلی زبانوں کی عمدہ کہانیوں، افسانوں اور شاعری کو اردو میں منتقل کیا جائے تاکہ اردو زبان میں اس تہذیبی ولسانی رنگارنگی کی بخوبی نمائندگی ہو جو ہمارے ملک کی خصوصیت ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کونسل کے تخلیقی ادب پینل کی آن لائن میٹنگ میں کہیں۔ انھوں نے کہا کہ زندہ زبانیں وہ ہوتی ہیں جو معاصر زبانوں کے ادبی وتخلیقی تغیرات سے نہ صرف آگاہ رہتی ہیں بلکہ انھیں اپناتی بھی ہیں، اسی نقطۂ نظر سے کونسل نے یہ طے کیا ہے کہ کونسل نہ صرف ہندوستان کی مختلف زبانوں بلکہ دنیا بھر کی اہم زبانوں کے افسانوں، کہانیوں اور شاعری وغیرہ کا ترجمہ شائع کرے گی۔ اس میٹنگ میں ترجمہ وتخلیق کے مختلف پروجیکٹس کا جائزہ لیا گیا اور اتفاق رائے سے انھیں جلد از جلد پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کیا گیا۔ میٹنگ میں کونسل کے ڈائریکٹر اور پینل کے معزز ممبران کی جانب سے ہندوستان کی علاقائی وقبائلی زبانوں کی بہترین تخلیقات کے ترجمے پر خاص زور دیا گیا اور یہ طے کیا گیا کہ کونسل کی جانب سے ڈوگری، بھوجپوری، کشمیری، بنگالی، کنڑ اور دیگر زبانوں کی نمائندہ کہانیاں، افسانے اور شاعری شائع کی جائے گی۔ کونسل کے ڈائریکٹر نے تمام ممبران سے اپیل کی کہ وہ اس سلسلے میں کونسل کو مشورے دیں اور میٹنگ کے علاوہ ذاتی طور پر بھی اپنی تجاویز پیش کریں کہ بچوں اور بڑوں کے لیے کس قسم کی کتابیں شائع کی جانی چاہئیں اور کس زبان کے ادب کا ترجمہ کیا جانا چاہیے۔ اس موقعے پر پینل کے ممبران نے آن لائن میٹنگ کے تجربے کو خوش آئند قرار دیتے ہوئے کونسل کا شکریہ ادا کیا۔ میٹنگ میں پینل کے چیئرمین نورالحسنین، شموئل احمد، مہرافروز، بلراج بخشی، وحشی سعید، سلمیٰ صنم، شبیر احمد، ملک زادہ جاوید، ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائریکٹر، اکیڈمک)، ڈاکٹر اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، ڈاکٹر فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، آبگینہ عارف (ٹیکنکل اسسٹنٹ) اور نایاب حسن موجود تھے۔ ●●

صحت وتندرستی اور قوتِ مدافعت کو بڑھانے میں یوگ کا غیر معمولی کردار: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دہلی: بین الاقوامی یوم یوگ کے موقعے پر قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے ڈائریکٹر شیخ عقیل احمد ڈیجیٹل طور پر یوگ سے جڑے۔ قابل ذکر ہے کہ اس سال کووڈ۔19 کی وجہ سے وزیراعظم نریندر مودی نے عالمی یومِ یوگ کو اپنے اپنے گھروں میں اور اپنے اہل خانہ کے ساتھ منانے کی اپیل کی تھی اور اقوامِ متحدہ کی جانب سے اس سال 'یوگ صحت کے لیے' اور 'یوگ کنبے کے ساتھ' یومِ یوگ کا تھیم قرار دیا گیا تھا۔ اس موقع پر ڈاکٹر عقیل نے یوگ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں یوگ کو اپنے معمولات کا حصہ بنانا چاہیے کیونکہ یوگ ایک بہترین ورزش ہے، جو نہ صرف ہمارے نظامِ صحت کو درست رکھتی ہے بلکہ بہت سی بیماریوں سے لڑنے کے لیے ہماری قوتِ مدافعت کو بھی مضبوط کرتی ہے۔ یومِ یوگ پر پورے ملک کے عوام کے تئیں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یوگ ہمارے جسم، ہماری سوچ اور ہماری روح کو پرسکون رکھنے کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ جسم اور دماغ کو ایک اصول میں پیوست کر کے زندگی کو سکون اور توازن سے ہمکنار کرتا ہے۔ زندگی کی الجھنوں گھٹن پریشانیوں اور بے چینیوں کے درمیان آپ کو اطمینان اور سکون کے احساس سے جوڑنے میں یوگ مددگار ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یوگا ہماری قدیم ہندوستانی روایات کا ایک انمول تحفہ ہے۔ یوگا ذہن وجسم، فکر وعمل میں وحدت پیدا کرتا ہے جو ہماری صحت وسلامتی کے لیے بہت قیمتی ہے۔ یوگا صرف ورزش نہیں ہے، یہ اپنے آپ اور دنیا وفطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہونے کے احساس کو دریافت کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ این سی پی یو ایل کے ڈائریکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ آج کے مشکل دور میں گھر پر رہتے ہوئے آپ یوگ کر کے ذہنی ونفسیاتی گھبراہٹ کو دور بھگا سکتے ہیں اور اپنے جسم میں لچک کے ساتھ طاقت اور دماغ میں خود اعتمادی بھر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ یوگ اپنی معنویت و افادیت کے اعتبار سے ساری دنیا کو متحد کرتا ہے اور خصوصاً خوفناک وبا کے موجودہ دور میں ہمارے اندر اس سے لڑنے اور اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی قوت و حوصلہ عطا کرتا ہے۔ ●●

قومی اردو کونسل کی بڑی حصول یابی، کونسل کے کمپیوٹر کورس کو وزارت برائے اسکل ڈیولپمنٹ سے منظوری ملی

اس سے اردو طلبہ و طالبات کے لیے کامیابی کی مزید راہیں کھلیں گی، کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد کا اظہارِ مسرت

نئی دہلی: اردو زبان کے طلبہ و طالبات کو کمپیوٹر اور جدید انفارمیشن ٹکنالوجی سے مربوط کرنے اور اس شعبے میں کریئر بنانے کا موقع فراہم کرنے کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تحت کمپیوٹر اپلی کیشنز، بزنس اکاؤنٹنگ اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کا ایک سالہ ڈپلوما کورس کروایا جاتا ہے۔ جس سے اب تک پورے ملک کے لاکھوں طلبہ و طالبات استفادہ کر چکے ہیں اور اس سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر مختلف سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں ملازمت کے حصول میں بھی کامیاب رہے ہیں۔ واضح رہے کہ کونسل کا یہ کورس نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف الیکٹرانکس اینڈ انفارمیشن ٹکنالوجی (نیلیٹ) چنڈی گڑھ (وزارت برائے الیکٹرانکس و انفارمیشن ٹکنالوجی) کے اشتراک سے چل رہا ہے اور اب اس کورس کو وزارت برائے اِسکل ڈیولپمنٹ کے تحت چلنے والے ادارہ نیشنل اسکل ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی جانب سے منظوری مل گئی ہے، جس سے اس کورس سے مستفید ہونے والے طلبہ و طالبات کے لیے کامیابی اور سرکاری و غیر سرکاری ملازمتوں کے امکانات مزید وسیع ہو گئے ہیں۔ اس موقعے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ یہ قومی کونسل کی بڑی حصولیابی ہے اور کونسل کے کمپیوٹر کورس کو اسکل ڈیولپمنٹ منسٹری سے منظوری ملنے کے بعد اس کورس کو مکمل کرنے والے طلبہ و طالبات کے لیے کامیابی کی راہیں مزید روشن ہو گئی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے بھی کونسل کا کمپیوٹر کورس مکمل کرنے کے بعد اس کے سرٹیفکیٹ کی بنیاد پر پرائیویٹ اور متعدد ریاستی حکومتوں کے اداروں میں ملازمت مل جاتی تھی مگر اب اس سے تمام ریاستوں اور مرکزی حکومت کے مختلف شعبوں میں بھی ملازمت کا حصول ممکن ہوگا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ قومی کونسل شروع سے ہی اردو دنیا کی ہمہ جہت ترقی کے لیے کوشاں ہے اور کونسل کے تحت چلنے والا کمپیوٹر کورس اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے، اس وقت پورے ملک میں کونسل کے پانچ سو سے زائد سینٹرز چل رہے ہیں جہاں سے ایک لاکھ سے زائد طلبہ و طالبات ڈپلوما ان کمپیوٹر اپلی کیشن، بزنس اکاؤنٹنگ اینڈ ملٹی لنگول ڈی ٹی پی کر کے اپنا کریئر بنا چکے ہیں۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ کونسل اردو دنیا کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور اردو کے طالب علموں کے روشن مستقبل کی تعمیر کے سلسلے میں اپنے مقاصد و اہداف کے حصول کے لیے پابندِ عہد ہے اور ہم مسلسل ایسی کوششیں کر رہے ہیں جن سے اردو زبان کی ترقی بھی ہو، ساتھ ہی اردو دنیا کو کمپیوٹر اور جدید ٹکنالوجی سے بھی مربوط کیا جائے اور اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے بچوں اور بچیوں کے لیے ترقی و کریئر کی نئی نئی راہیں بھی ہموار کی جائیں۔ ●●

اردو کے ممتاز شاعر اور مشترکہ تہذیب کے علم بردار گلزار دہلوی کی وفات پر انجمن ترقی اردو (ہند) کی تعزیتی قرارداد

نئی دہلی: 13/جون 2019 (پریس ریلیز) اُردو کے مشہور و ممتاز اور بزرگ شاعر پنڈت آنند موہن زتشی گلزار دہلوی کا 12 جون 2020 کو نوئیڈا میں واقع ان کی قیام گاہ پر انتقال ہو گیا۔ اُن کی وفات پر انجمن ترقی اردو (ہند) نے ایک تعزیتی قرارداد پاس کی جس میں اُن کی شخصیت اور خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی اور کہا گیا کہ وہ ایک ہر دل عزیز اور ممتاز شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد اہم خوبیوں اور صفات کے حامل انسان بھی تھے۔ وہ انجمن کی مجلسِ عاملہ کے معزز رکن تھے۔ اُن کے انتقال سے انجمن اپنے ایک دیرینہ اور مخلص رکن سے محروم ہو گئی۔

واضح ہو کہ گلزار دہلوی 7 جولائی 1926 کو دہلی کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد پنڈت تربھون ناتھ زتشی زار دہلوی اور والدہ رانی زتشی دونوں اپنے زمانے کے معروف شاعر تھے۔ ان کی والدہ کا تخلص بیزار تھا۔ گلزار دہلوی کو زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ انھوں نے منفرد لب و لہجے کے شاعر کے طور پر اُردو دُنیا میں شناخت قائم کی۔ آزادی کے بعد ہندستان میں اُردو زبان و ادب کی بقا اور ترقی و ترویج میں انھوں نے غیر معمولی کردار ادا کیا نیز پوری زندگی قومی و بین الاقوامی سطح پر اُردو کی مشترکہ تہذیب کی نمائندگی کرتے رہے۔ گلزار دہلوی کی مطبوعات میں ''گلزارِ غزل'' اور ''کلّیاتِ گلزار دہلوی'' ہیں جب کہ ان کی شخصیت اور خدمات پر لکھی جانے والی کتابوں میں ''کچھ دیکھے کچھ سنے'' اور ''مشاعرہ جشنِ جمہوریت 1973'' شامل ہیں۔ موقر رسالہ ''چہارسو'' نے گلزار دہلوی کی شخصیت اور ان کی خدمات پر مشتمل خصوصی شمارہ شائع کیا۔ وہ ''سائنس کی دنیا'' کے اڈیٹر رہے، جو 1975 میں حکومتِ ہند کے ذریعے شائع ہونے والا پہلا اُردو کا سائنسی رسالہ تھا۔ گلزار دہلوی کی علمی و شعری خدمات کے اعتراف میں انھیں متعدد انعامات و اعزازات سے سرفراز کیا گیا۔

انجمن ترقی اردو (ہند) محسوس کرتی ہے کہ گلزار دہلوی کی وفات سے ایک زرّیں عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ بلاشبہ شعری و ادبی محفلوں کی جان ہوا کرتے تھے نیز ملک کی مشترکہ تہذیب و تمدن کے امین اور پاسدار تھے۔ انجمن دعا گو ہے کہ خدا مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ ●●

سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا

ڈاکٹر شفق

جبلپور

ہندوستان میں ایسے ادبی ماہنامے بہت کم ہیں جو پورے طور پر غیر سرکاری ہوں اور ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہے ہوں۔ سبق اردو ایک ادبی اور معیاری ماہنامہ تو تھا مگر عام رسائل کی طرح وقت کا پابند نہ تھا، ادھر تین شمارے، شمارہ نمبر ۴۹، ۵۰، ۵۱ ویب سائٹ www.sabaqeurdu.com پر دیکھا تو بہت خوشی ہوئی۔ تین شمارے متواتر شائع کر کے آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر سبق اردو اسی معیار کے ساتھ پابندی سے شائع ہوتا رہا تو اردو دنیا کا بہترین غیر سرکاری ماہنامہ ہوگا۔ اسی محنت سے کام کرتے رہیے، ادبی دنیا میں آپ کا کا نام سبق اردو کی وجہ سے اہمیت کا حامل ہو۔

UGC-CARE List SERIAL NO. of SABAQ E URDU is:14

INTERNATIONAL REFEREED JOURNAL

ISSN 2321-1601

SABAQ E URDU (Monthly)

Infront of Police Chouki,Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi, UP,INDIA

EDITORIAL BOARD

INDIA

1.PROFESSOR KHAWAJA IKRAM UDDIN
DEPT.OF URDU,JNU,DELHI
2.PROFESSOR IBNE KANWAL
DEPT.OF URDU,DELHI UNIVERSITY,DELHI
3.PROFESSOR SHAHZAD ANJUM
HOD ,JAMIA MILLIA ISLAMIA
4.PROFESSOR SHAIKH AQUIL AHMAD
DEPT.OF URDU,SATYAWATI COLLEGE,(DELHI INIVERSITY)
5.DR.ZEBA MAHMOOD
HOD,DEPT.OF URDU
G.S.P.G.COLLEGE,SULTANPUR(UP)
6.DR.AJAY MALVIYA,ALLAHABAD
G.C.MEMBER OF SAHITYA AKADEMI,NEW DELHI

FOREIGN

1.PROFESSOR NASIR ABBAS NAYYAR
FICTON WRITER &CRITIC
2.PROFESSOR SOYA MA NE,WRITER
JAPAN
3.DR. IBRAHIM MOHD IBRAHIM
DEPT. OF URDU,AL-ALAZHAR UNIVERSITY,EGYPT
danish4@hotmail.com
4.PROFESSOR SOHAIL ABBAS
DEPT. OF URDU,UNIVERSITY OF TOKYO
abbaskhansuhail@gmail.com
5.DR.ALI BYAT
DEPT.OF URDU UNIVERSITY OF TEHRAN
bayatali@ut.ac.ir

CHIEF EDITOR: DR. DANISH ALLAHABADI
EDITOR: DR.MOHD.SALEEM